فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۲۰

(بہ ترتیب حروفِ تہجی)

ماہ جنوری سنہ ۱۹۷۷ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۷۷ء

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۲۰

ماہ جنوری ۱۹۷۷ء تا جون ۱۹۷۷ء

بہ ترتیب حروف تہجی

جلد ۱۲۰ ماہ جنوری ۱۹۷۷ء مطابق محرّم الحرام ۱۳۹۷ھ عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

آہ! مولانا عبدالماجد دریابادی

معارف کے زیرِ نظر شمارہ کی کتابت ہو چکی تھی کہ فخرِ روزگار، یگانۂ وقت، مجاہد العلم، رئیس القلم اور دار المصنفین کی مجلسِ ارکان کے صدر نشین مولانا عبدالماجد دریابادی کی رحلت کی اچانک خبر ریڈیو سے سنی تو ع عجیب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان کی زندگی کی شاندار کتاب ختم ہو گئی، جس کا ہر ورق اپنی گوناگوں خوبیوں سے مزین رہا، یہ عاجز رقم گذشتہ ۴۲ سال سے ایک ادنیٰ خورد کی حیثیت سے انکی بزرگانہ شفقت اور علمی جلالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا رہا، اس مدت میں انکی زندگی کی جو سرگرمیاں رہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھوم گئیں!

گل و آئینہ کیا، خورشید و مہ کیا جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کرنے کے بعد ان کی زندگی کا آغاز الحاد و بے دینی کی وادی کی سیر سے ہوا، مگر یہیں ان کی نظر شعلۂ طور بنکر چمکی، جس کے بعد وہ توحید اور رسالت کے ایسے داعی اور مبلغ بنے کہ سند یافتہ عالم نہ ہونے کے باوجود باوقار عالم تسلیم کیے گئے، اچھے اچھے علماء انکے سامنے جھکے، کبھی علماء کی مجلس کے سرخیل بھی منتخب ہوئے اور ان کا خاتمہ بالخیر کلامِ پاک کے مفسر اور شارح کی حیثیت سے ہوا، انھوں نے اردو اور انگریزی میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں اسرائیلیات کی فتنہ سامانیوں اور توریت و انجیل کی تحریفات کی شر انگیزیوں کی راز کشائی میں جو دیدہ وری اور نکتہ وری دکھائی ہے، اس سے کلامِ پاک کے مفسروں میں اُن کا مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا، ان کی یہ تفسیر گنجینۂ معارف و تحقیق بھی سمجھی جاتی رہے گی

وہ کچھ دنوں تک فلسفی بھی رہے، ان کی فلسفۂ جذبات اور فلسفۂ اجتماع انکی ابتدائی دور کی تصانیف ہیں، جن کے بعد انکی مبادی فلسفہ کی دو جلدیں فلسفہ اور اسکی تعلیم، ہم اور آپ بھی نکلیں،

ان کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا، اور جب اردو کا خالی دامن انکے فلسفیانہ خیالات سے پُر ہو رہا تھا تو انھوں نے فلسفہ کے چناں و چنیں سے منہ موڑ کر اقبال ہی کی طرح پیرِ روم کو اپنا معنوی مرشد قرار دیا، اسلامی تصوف اور فیہ مافیہ لکھکر راہ سلوک کے ایک پُرجوش سالک بن گئے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت بھی ہوئے، مگر حکیم الامت لکھکر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تعلیمات کے اسرار و رموز کے شارح بنے، جس کے بعد ع جس طرف کو لے چلا رہبر چلے۔

وہ بڑے اچھے مترجم بھی تھے، انگریزی سے اردو میں برکلے کے مکالمات، لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ، بکل کی تاریخ تمدن، ہیوپال کی پیام امن کے ترجمے کیے، انکے ترجمے میں اصل کتاب ہی کی لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے، ان کتابوں سے یورپ کے تہذیب تمدن سے واقف ہوئے تو ان سے متاثر ہونے کے بجائے ان کو یاجوجی تمدن اور دجالی فتنہ قرار دیا، وہاں کی فحاشی، عریانی، رندی اور بے راہ روی پر اپنی مختلف تحریروں سے ایسی کاری ضربیں لگاتے رہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کو یورپ کی تمدنی فریب کاریوں سے بچایا ہے ان میں اُن کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

وہ اردو تنقید نگاری کے ایک خاص رنگ کے امام بھی رہے، اردو شعر و ادب کی رمز شناسی میں ان سے شاید ہی کوئی سبقت لیجا سکا، لکھنوی تہذیب کے ساتھ لکھنؤ کی شاعری اور اسکے نثری اسلوب کے بڑے دلدادہ تھے، زہرِ عشق، مرزا رسوا اور گل بکاؤلی پر ان کے تبصرے انکے نقادانہ دقتِ نظر کے شاہکار ہیں، غالب کو ایک فلسفی کے بجائے ہر بات کو حکیمانہ انداز میں کہنے والا شاعر، مرزا شوق کو ایک بدنام شاعر، حالی کو ایک واعظ شاعر، اکبر الہ آبادی کی شوخی اور دل لگی کو ایک نیا آئین اکبری، شکوہ والے اقبال کو صاحبِ حال اور سالک، اور جوابِ شکوہ کے اقبال کو صاحبِ مقام اور عارف کہکر نقادوں کے ذہن کے لیے نئے دریچے کھول دیے۔

وہ اپنے زمانہ میں اردو کی انشا پردازی کے بھی امام رہے، وہ اپنے طرز کے موجد اور خاتم تھے

شبلیؒ، مہدی افادی اور سید سلیمانؒ کے انداز بیان کے بڑے پرستار اور قدر دان تھے، مگر اپنے طرز نگارش میں کسی کی تقلید پسند نہیں کی، بالکل منفرد اور غیر مقلد رہے، ان کی تحریروں میں جہاں تندیٔ صہبا، موجِ خرام یار، نکہتِ بادِ بہاری، اور فکری لالہ کاری ملے گی وہاں کج رو حریفوں کے مقابلہ میں سانپ کی پھنکار، بچھو کا ڈنک اور خنجر کا وار بھی ہے، وہ اپنے مخالفوں کے خلاف اپنے قلم سے صف شکن یلغار اور مردافگن یورش کرکے اپنی انشا پردازی کا جوہر دکھاتے، اپنے عزیز دوستوں اور محبوب معاصروں کی موت پر ماتم کرتے تو اس میں دلسوزی، عقیدتمندی اور وفاکیشی کے ساتھ انکے قلم کی رعنائی، شگفتگی اور رنگینی کی پوری بہار آفریں قوس قزح نظر آتی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، بہادر یار جنگ سید سلیمان ندوی اور حکیم عبدالحمید لکھنوی پر انکی ماتمی تحریروں میں انکے زور بیان کے ساتھ اثر، تاثیر اخلاص محبت اور درد کے جھلملاتے جواہر ریزے نظر آتے ہیں، انکے مضامین کے مجموعے انشائے ماجدی میں جمع کردیے گئے ہیں جو ہر زمانہ میں بلاغت کی سحر کاری، فصاحت کی تازگی اور سلاست کی پرکاری کے لحاظ سے اردو ادب کے شہ پارے بنے رہیں گے، یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی زبان کا بانکپن اور رسیلا پن دکھانے والا سفر حجاز اور تفسیر کی زبان لکھنے میں کس قدر باوقار، باوزن اور متین ہو گیا ہے۔

انھوں نے سچ اور صدق نکالکر اپنے کو شیر دل بلکہ کفن بر دوش صحافی بھی ثابت کیا، حکومت کا دبدبہ، قانون کا شکنجہ، انقلاب کا کوئی ہچکولہ ان کے قلم کی آزادی کو نہ روک سکا، مسلمانوں کے غمخوار، غمگسار اور دمساز بنکر انکے سیاسی المناک حوادث پر خون کے آنسو روئے، انکی سیاسی کامیابی اور فتح پر اپنی مسرت و شادمانی کا اظہار دل کھولکر کیا، خواہ انکی یہ تحریریں حکومت کی پالیسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتیں، سچ اور صدق جدید میں سچی باتیں لکھکر ایمان، ایقان اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے، اس انداز کی تحریر اب مدت مدید تک کوئی اور نہ لکھ سکے گا، اسی کے ساتھ اسلامی طرز فکر کی راہ چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے

والوں کے نہاں خانے میں پہنچکر شبخون مارتے، اپنی تحریروں کی ناوک فگنی سے تجدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے، انکے اخبار کا ایک شذرہ، ایک جلی سرخی، ایک زہریلا فقرہ انکے حریفوں کے پورے مضمون پر بھاری ہوتا۔

ان کا چھوٹے سائز کا ہفتہ وار اخبار سچ یا صدق جدید کل آٹھ صفحے پر مشتمل ہوتا، اسکو شروع سے آخر تک خود ہی لکھتے جو انکے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی، اس میں کبھی تو واعظ، کبھی فقیہ، کبھی مجتہد، کبھی مرد مومن، کبھی مفسر قرآن، کبھی متکلم اسلام، کبھی نقاد، کبھی سیاسی مبصر اور ہاں کبھی قلم کے افراسیاب، کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زور بیان کے رستم بنجاتے، وہ اپنی آخر عمر میں خوش ہوں گے کہ علم، ادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل و گلزار لگاکر زندگی ختم کر رہے ہیں۔

وہ خلافت تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علیؒ کے اصرار سے شریک ہوئے، مگر کبھی سیاسی رہنما ہونے کے دعویدار نہیں ہوئے، البتہ علی برادران کی طرح جو کھدر کا کرتہ اور پائجامہ اور جبہ پہنا تو آخر عمر تک پہنتے رہے، مولانا محمد علی کے نام پر جان چھڑکتے رہے، انکی یاد میں محمد علی کی ڈائری کے نام سے جو ۲ دو جلدیں لکھی ہیں ان میں انکے نہ صرف دل و جگر کے ٹکڑے بلکہ انشا پردازانہ کمالات کے سارے جلوے نظر آتے ہیں، مولانا محمد علی پر ان دونوں جلدوں سے بہتر ابتک کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی،

دارالمصنفین کی اکسٹھ ۶۱ سالہ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں اسکے ہمدم اور ہمراز بنے رہے، شروع میں اسکی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، پھر اسکی مجلس ارکان کے صدر بھی ہو گئے، اسکا شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہوا ہو جس میں انکی شرکت نہ ہوئی ہو، آخری بار گذشتہ نومبر میں انکی علالت کے زمانہ میں ملنے گیا تو رخصت کرتے وقت فرمایا کہ خدا کرے دارالمصنفین کے آیندہ جلسہ میں پھر حاضری کا موقع ملجائے، وہ یہاں تشریف لاتے تو تمام لوگ انکے سامنے مودب بیٹھتے، سید صاحب سے وہ عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر وہ انکا بڑا احترام کرتے، ان کو کوئی خط لکھتے تو اس احترام کو برقرار رکھتے، خود وہ سید صاحب کی بڑی عزت بلکہ ان سے بڑی محبت کرتے، جب کبھی ان پر کوئی مضمون لکھا، انکا قلم بہت ہی رواں اور شگفتہ ہو گیا، مولوی مسعود علی ندوی سے انکی بڑی

بے تکلفی رہتی، وہ طبعاً بہت ہی متین، سنجیدہ اور خاموش تھے، کسی مجلس میں مشکل سے کچھ بولتے، مگر مولوی مسعود علی ندوی سے باتیں کرتے تو عندلیب شیوابیان بن جاتے، صدق میں ان سے کسی سے قلمی جنگ شروع ہوجاتی تو سید صاحب فرماتے کہ ان کے گوریلا جنگ کے خلاف کسی کا کامیاب ہونا آسان نہیں، سید صاحب کے بعد وہ دارالمصنفین کے علمی محتسب بھی بن گئے تھے، معارف اور یہاں کی نئی تصانیف ان کی خدمت میں ضرور بھیجی جاتیں، زبان اور انداز بیان میں کوئی فروگذاشت ہوجاتی تو اسکی طرف توجہ ضرور دلاتے اور جو چیز پسند آجاتی اسکی تعریف دل کھولکر کرتے، افسوس دارالمصنفین اپنے ایک بڑے علمی محتسب سے محروم ہوگیا

ان تمام اوصاف کے ساتھ ان کا ایک بہت بڑا وصف یہ بھی تھا کہ انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اسلامی حمیت کی دیدبانی، اسلامی شعار کی پاسبانی اور ملی غیرت کی رجز خوانی کی، انکی تفسیر کیا تھا ان کا وہ سوز نہاں اور درد پنہاں جو انکے دل میں اسلام کیلیے رہا، انکا توشۂ آخرت بنے گا، ان ہی کی بدولت جنت کے رضوان نے انکا خیر مقدم کیا ہوگا اور حوریں پیشوائی میں شراب طہور کا مینا و ساغر لے کر بڑھی ہوں گی،

ان سطروں کے لکھتے وقت اخبار سے معلوم ہوا کہ ان کے جنازہ کی نماز ندوۃ العلماء کے احاطہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، مولانا علی میاں سے تو وہ محبت نہیں بلکہ عشق کرتے، ندوہ سے بھی انکو غیر معمولی لگاؤ رہا، ندوہ میں مولانا علی میاں نے انکے جنازہ کی نماز پڑھا کر اپنا فرض اور قرض دونوں ادا کیا، یہ راقم بخار میں مبتلا تھا، اسلیے تعزیت میں نہیں پہنچ سکا لیکن جنازہ کی شرکت کیلیے ایک سہ رکنی وفد دارالمصنفین کی طرف سے بھی گیا، دل کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ سطریں بستر علالت ہی پر سے قلمبند کیجا رہی ہیں۔ ع اے نالہ! نشانِ جگر سوختہ کہاں ہے۔ ی،

موت سے کس کو رستگاری ہے، مگر مولانا سپرد خاک ہوئے تو انکے سینہ میں علم کی جو ہمہ گیری، قلم کی جو صاحبقرانی تحریر کی جو برق دمشی، علم و عرفان کی جو فرمانروائی، اور اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جو قلمی سرفروشی اور جانبازی تھی وہ بھی ان کے ساتھ زیر خاک ہوگئی، عالم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، اسلامی روایات کی تیری حدی خوانی پر رحمت، تیرے قلم کی اس کوہ کنی پر رحمت جس سے جوئے شیر اسلامیہ بہتی نظر آتی، الوداع، السلام، تو جا چکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مقالات

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ہرویؒ

از
پروفیسر سید حسن پٹنہ

(۲)

جب خواجۂ انصار پھر وطن واپس آئے تو دشمنوں کی دسیسہ کاری پھر تیز ہوگئی، سلجوقی ہرات پر قابض ہو چکے تھے اور جنگ و جدل کے ہنگامے بھی سرد پڑ چکے تھے، خواجہ کے دشمنوں نے اس مرتبہ ان کے خلاف علانیہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ ان کا ہرات میں موجود رہنا فتنہ کا سبب ہوگا، لہذا انھیں شہر سے باہر چلا جانا چاہئے، دشمنوں کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگئی اور خواجہ کو پھر وطن ترک کرنا پڑا، اس مرتبہ بھی وہ شکیوان چلے گئے، لیکن چند ماہ کے بعد ہی سال ۴۷۶ھ کے آغاز میں ہرات کو مراجعت کی اور پھر تدریس و تعلیم میں مشغول ہوگئے، لیکن اس دفعہ انھوں نے اپنا موضوع تدریس بدل دیا، اس سے قبل وہ حدیث کا درس دیا کرتے تھے لیکن اب انھوں نے پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کو اپنے درس کا موضوع بنایا، جس طرح وہ حدیث کی تدریس میں شریعت کی باتیں بتایا کرتے تھے، تدریس تفسیر کلام اللہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا، اس کے علاوہ انھوں نے اپنی مجلسوں میں اہل بدعت کے خلاف تقریر کرنا ترک نہیں کیا تھا، جس کا اثر یہ ہوا کہ معتزلہ اور اشاعرہ نے باہم متفق و متحد ہوکر ان کو آزار پہنچانے کی کوشش شروع کی اور اپنے

مقصد میں وہ اس حد تک کامیاب ہوگئے کہ خواجہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر انھیں پوشنج کے نزدیک ایک زنداں میں مقید کر دیا۔

خواجہ ہرات میں ایک سال تک زندانی رہے، اس مدت میں انھیں اپنی زندگی اور اعمال کے بارے میں غور و فکر کرنے کی مہلت ملی، اس دوران میں انھیں اپنے والد، اپنے استاد خواجہ طاقی اور شیخ ابوالحسن خرقانی کی برابر یاد آتی رہی جنھوں نے ان کے افکار و عقائد کو زبردست طریقے پر متاثر کیا تھا، ان تینوں بزرگوں کی یادیں اور باتیں ان کے دل و دماغ پر اس طرح چھائی ہوئی تھیں کہ جن محدثین، مفسرین، فقہا اور علماء سے ان کی ملاقاتیں ہوئی تھیں وہ سب اُن کی یاد سے تقریباً محو ہوگئے تھے، انھوں نے اس بات کا عزم کرلیا کہ وہ آیندہ اپنے اعمال اور تدریس و ارشاد میں اصل کی طرف متوجہ رہیں گے، اگرچہ انھیں یہ بھی خیال بار بار آتا تھا کہ ان کے تلامذہ اسرار تصوف کو سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے، لیکن انھوں نے اپنے سے سوال کیا کہ آیا شاگردوں اور مریدوں کی خامی کا خیال کرکے صرف شریعت کی تدریس پر اکتفا کرنا درست ہوگا؟ اس کے جواب میں وہ اپنے دل کو سمجھا لیتے تھے کہ قرآن بندہ کی رہنمائی محبت کی طرف کرتا ہے اور ایمان سنت اور رسول کی پیروی اس محبت میں شامل ہے، لہذا جب وہ ۴۳۹ھ میں پوشنج کے قید خانہ سے رہائی پاکر ہرات واپس آئے اور تفسیر کا درس دینا شروع کیا تو بہت جلد اس آیت کریمہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کی تفسیر تک پہنچ گئے، انھوں نے اپنی عمر کا خاصا حصہ اس آیت کی تفسیر میں گزارا، وہ نئے طرز تقریر و تفسیر میں اس قدر سرگرم ہوئے کہ مدت تک مخالفین سے مناظرہ کرنا ترک کر دیا اور اس وجہ سے وہ بھی مخالفت سے باز رہے۔

ملک ہنوز سیاسی استحکام اور امن سے کوسوں دور تھا، سلطان مسعود کا فرزند اور جانشین سلطان مودود غزنوی اس کوشش میں تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی شہنشاہیت واپس لے

لیکن وہ عین شباب میں جبکہ اس کا سن انتیس ۲۹ سال تھا، ۴۴۱ھ میں فوت ہوگیا، اس کے بعد کئی بادشاہ غزنین کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے، لیکن ہر ایک مختصر مدت کے لیے حکمرانی کر کے یا تو وفات پاگئے یا قتل ہوئے، غزنوی بادشاہوں کی طاقت زائل ہو چکی تھی، اُدھر سلجوقیوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے، ان کی پیش قدمی کو روکنا محال تھا، ان کے سرداروں میں سے ایک نے بنام داؤد سلجوقی بلخ کو مسخر کیا اور دوسرے نے بنام ینیغو ہرات پر تسلط حاصل کرلیا۔

اس دوران میں اگرچہ مخالفین کی طرف سے پیر ہرات کو کچھ اطمینان ہو گیا تھا لیکن انھیں دوسری قسم کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، ۴۴۱ھ میں شیخ عمو کی وفات ہوگئی جنھوں نے بچپن سے ان کی نگرانی و پرورش کی تھی، اور خواجہ کے والد ابو منصور کے بلخ کو چلے جانے کے بعد انھیں سہارا دیا تھا، شیخ عمو کی موت سے خواجہ ہرات بے یار و مددگار رہ گئے، ان کی مالی حالت نہایت خراب تھی، شیخ عمو ان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے، ان کے نہ رہنے کی وجہ سے خواجہ ہرات کو فقر و فاقہ کی نوبت آگئی، گھر کا اثاثہ فروخت کر کے غذا مہیا کرتے تھے، یہاں تک کہ دروازوں کی میخوں اور زنجیروں کو بھی بیچنا پڑا، بعض دن فاقہ میں گذر جاتا تھا، ان کی تنگدستی و بینوائی کی یہ حالت تھی کہ سخت سردیوں میں بھی ان کے پاس پہننے کو کپڑا نہیں ہوتا تھا، جامی نے نفحات الانس میں ان کی اس حالت کو خواجہ کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے:۔

”من بہ زمستاں جبہ نداشتم، و سرمای عظیم بود، و در ہمہ خانہ من بوریائی بود کہ بر آن خفتمی و نمد پارہ کہ بر خود پوشیدمی واگر پای را پوشیدمی سر برہنہ شدی خشتیکہ بر زیر سر نہادمی و میخیکہ کہ جامۂ مجلس بروں کردمی و بیاویختمی!“

فقر و فاقہ کی اس حالت میں بھی وہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتے تھے، جامی نے

اس طرح کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے:-

"شیخ الاسلام گفت، من مجرد بودم و ہیچ چیز نداشتم، سائلی چیزی خواست اندیشیدم کہ دی را چہ دہم؟ مرا ہیچ چیز نبود، از دنیا مگر کاردکی کہ بدآں قلم می تراشیدم بیاوردم و بدوی دادم۔"

حالانکہ شیخ انصار کے کئی دوست مالدار و ثروتمند تھے، لیکن انھوں نے اپنے دوستوں پر اپنی بینوائی و محتاجی ظاہر نہیں کی، خود ان کو بھی خواجہ ہرات کی حاجتمندی کی خبر نہ ہوئی، البتہ ایک دن ان کا ایک دوست ان کے یہاں آیا تو خواجہ کی حالت دیکھ کر بہت متعجب ہوا اور رونے لگا، پھر سر سے دستار اتار کر ان کے سامنے رکھ دیا اور چلا گیا،

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ کو دین کی شوکت و وقار کا بہت خیال رہتا تھا، عسرت اور مفلسی کے زمانے میں بھی وہ تدریس و تعلیم کے وقت اچھا لباس پہننا ضروری سمجھتے تھے، مجلس سے واپس آکر وہ اس "جامۂ مجلس" کو دیوار پر میخ سے لٹکا دیتے تھے، اگر کبھی اچھا لباس خود اپنے پاس نہیں ہوتا تو کسی دوست سے عاریۃً لے لیتے تھے،

اگرچہ خواجہ ہرات نے تقریباً دس سال بڑے مصائب میں گذارے، ہرات سے جلاوطنی، قید زنداں، مخالفین کی دسیسہ کاریاں، اس کے بعد بینوائی و محتاجی، لیکن انھوں نے غم و اندوہ کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا، اور برابر تذکیر و تقریر میں مشغول رہے، البتہ کبھی کبھی اندوہگیں ہو جاتے تھے، لیکن خداوند تعالیٰ پھر ان میں جرأت و ہمت پیدا کر دیتا تھا، ایک بار وہ اپنے گھر کے دروازے پر کسی امر کے متعلق اندیشناک بیٹھے ہوئے تھے کہ یک بیک تیز ہوا چلنے لگی، اور کاغذ کا ایک ٹکڑا دروازے کے پاس آگرا جس پر سرخ روشنائی سے تحریر تھا "فرج، فرج" یعنی کشائش، کشائش۔

سال ۴۴۵ ہجری کی ابتدا میں سلطان طغرل بیگ سلجوقی نے یہ فرمان جاری کیا کہ اہل بدعت کو جن میں اشاعرہ بھی شامل تھے، تعلیم و تدریس سے روک دیا جائے، ان کے مکتبوں پر پابندی لگا دی جائے اور مساجد کے منبروں سے ان کی گمراہی کا اعلان کیا جائے، اس فرمان کے جاری کرانے میں درحقیقت سلطان طغرل بیگ کے دبیر عمید الملک ابو نصر کندری کا ہاتھ تھا، جو شخصاً اشعریوں کا مخالف تھا، اس کے علاوہ کرسی وزارت حاصل کرنے میں ایک اشعری ابو سہل ابن الموفق سے رقابت و ہمچشمی رکھتا تھا، سلطان کے اس فرمان سے بہت سے لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا، حتی کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو اپنے کو اہل سنت کہتے تھے (اور معتزلیوں اور حنبلیوں سے اختلاف رکھتے تھے (کیونکہ بعض حنبلیوں پر خدا تعالیٰ کو صفاتِ بشری سے مجسم کرنے کا الزام عاید کیا گیا تھا) اس فرمان کی زد میں آگئے، سرکاری عملے شوافع کو بھی سزا دینے لگے تھے، اور انھیں تدریس سے روک دیتے تھے، ابو سہل ابن الموفق نے سلطان سے چارہ جوئی کی کوشش کی لیکن بے سود، نیشاپور کے مکتبوں کے بہت سے معلمین قید کر دیے گئے، عوام الناس نے ابوالقاسم قشیری کے مکان پر حملہ کیا اور انھیں پکڑ کر قلعہ میں بند کرا دیا، خود ابن الموفق نے رے جا کر سلطان کے پاس اشعریوں کی بیگناہی ثابت کرنا چاہی لیکن اس کا اثر الٹا ہوا، اسے قید کر دیا اور اس کا مال ضبط کر لیا گیا، اشعریوں نے جب یہ دیکھا کہ سلطان کو وہ ارادے سے بدل نہیں سکتے، تو انھوں نے قلم کا سہارا لیا، ابوالقاسم قشیری نے اشاعرہ پر جو الزامات تھے ان کی تردید میں ایک رسالہ بنام "الشکایۃ اہل السنۃ بحکایۃ ما نالہم من المحنۃ"[1] لکھا جو سارے اسلامی ممالک میں نشر کیا گیا،

---

[1] ابن عساکر نے تبیین جلد ہشتم میں اس رسالے کے متعلق یہ لکھا ہے کہ قشیری نے اشعریوں کے عقائد کی شرح کرتے ہوئے [illegible] الزام کو رد کیا ہے کہ اشعریوں کا پانچ عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر موت کے بعد پیغمبر نہیں رہتا، مکافات و مجازات خداوندی بندوں کے فرمانبر و نافرمان ہونے پر موقوف نہیں ہے، موسیٰ علیہ السلام نے ندائے ربانی

(باقی ص ۱۰ پر)

امام ابوبکر بیہقی نے بھی اسی قسم کے خط ابونصر کندری کو لکھ بھیجے لیکن ان کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، آخر وہ تھک کر آیندہ موقع کے انتظار میں خاموش ہو گئے۔

اہل بدعت خصوصاً اشاعرہ کے خلاف جو اقدامات عمل میں آئے ان سے پیر ہرات کو بڑی خوشی اور تسکین ہوئی کہ ان کے دشمنوں کو جلاوطن اور قید کیا گیا، اب وہ پورے سکون کے ساتھ مجلس تدریس میں ذکر و تفسیر میں مشغول رہنے لگے، ان کی بزرگی کی شہرت اطراف واکناف میں پھیل گئی تھی، ۴۴۵ھ میں جو اہل علم اصحاب ہرات سے گزرتے تھے وہ انکی ملاقات کو آتے تھے، منجملہ ان کے دو شخص تو ان کی دیدار کے بہت ہی مشتاق تھے، ایک تو ابوالحسن باخرزی جو ایک ادیب شہیر ابو عاصم فضیلی کی رہبری میں خواجہ کی ملاقات کو گئے اور ان کی قوت تقریر اور انداز تفسیر سے بہت متحیر ہوئے، دوسرے شخص جو خواجۂ ہرات کے دلدادہ و فریفتہ ہوئے وہ تھے ابوالقاسم زوزنی جو بارع[1] کے نام سے مشہور تھے، باخرزی کی عمید الملک ابونصر کندری سے دوستی تھی، اس واسطے سے خواجۂ ہرات سے بھی ارتباط پیدا ہو گیا تھا ۴۴۶ھ میں ابوالعلا صاعد ابن سیار کو ہرات کا منصب قضا تفویض ہوا، یہ شخص حنبلی مسلک کا پیرو تھا، اس وجہ سے خواجہ ہرات سے دوستی پیدا ہو گئی، ایک دن قاضی ابن سیار نے خواجۂ ہرات کو دعوت دی تھی اور اپنے بائیں جانب بٹھایا، جو مقام احترام ہوتا ہے، داہنی طرف ایک دوسرا مہمان تھا جو بوسعد نیشاپوری کا شاگرد تھا، یہ شخص کچھ متکبر و خود پسند تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۹) سنی تھی، کلام اللہ وہ نہیں ہے، جس کی وقایہ مصحف میں شیرازہ بندی کی گئی ہے، عوام کافر ہیں۔ یہ پانچوں عقیدے ناحق اشاعرہ کے سر تھوپ دیے گئے ہیں،

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ابوالقاسم البارع محدث بھی تھے، نیشاپور اور بغداد میں زندگی بسر کی۔ ہیری کا میں ۵۰۲ھ میں فوت ہوئے۔

اور بدتمیزی سے باتیں کرتا تھا، خواجہ کو اس کی بات بری لگی، وہ الگ ہٹ گئے اور بولے:۔

"پیاز خوردن را چشم تیز باید، چوب شکستن را بازوی قوی مگر در صدر مجلس نشستن را جز دانش چیزے نباید!"۔

قاضی ابن سیار کو بھی اس مہمان کی بات پسند نہ ہوئی اور کہا "کس چیز نے تمہیں اکڑا ہے، یہی ناکہ ان کے پاس لباس اور گھوڑا نہیں ہے" یہ کہکر انھوں نے خواجہ ہرات کو قبا اور گھوڑا عطا کیا اور مسجد جامع ہرات میں ایک کرسی[1] و مقام بھی مقرر کر دیا، اس دن سے خواجہ ہرات کی مجلسیں اسی مقام پر منعقد ہوتی تھیں اور وہ اس کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے تھے، خواجہ ہرات کے مجالس تذکیر و ارشاد کی روز افزوں شہرت اور ابونصر کندری و قاضی ابن سیار سے ان کے ارتباط و دوستی کو دیکھ کر خواجۂ انصاری کے دشمنوں کو بڑی پریشانی لاحق ہو گئی تھی، حالات ایسے تھے کہ ان کے خلاف زبان نہیں کھول سکتے تھے، اس لیے ان کے دلوں میں غم و غصہ و بغض و عداوت کی آگ سلگتی رہتی تھی، حالات کے مساعد ہونے کے منتظر تھے، اتفاقاً سیاست میں ایسا الٹ پھیر واقع ہوا کہ انھیں خواجۂ ہرات سے انتقام لینے کا موقع مل ہی گیا، ۴۵۰ھ کے اواخر میں داؤد سلجوقی کا بیٹا الپ ارسلان ہرات سے گذرا، وہ سلطان طغرل بیگ کی طلب پر اس کی مدد کو جا رہا تھا، کیونکہ طغرل بیگ کے بھائی ابراہیم اینال نے بغاوت کر دی تھی، الپ ارسلان ان لوگوں کا سخت مخالف تھا، جو خدای تعالی کو صفات انسانی سے مجسم بتاتے ہیں، مخالفین خواجہ نے کوشش کی کہ ان کی مجالس کو بند کرادینے کا ایک فرمان الپ ارسلان سے حاصل کر لیں، لیکن اس وقت الپ ارسلان ایک مہم پر جا رہا تھا، اور اس قسم کی مذہبی جنگ میں مشغول ہونے کی اسے فرصت نہیں تھی،

[1] یہ کرسی جو بہت اونچی نہ تھی اور جس پر خواجہ ہرات بیٹھکر وعظ کہتے تھے محفوظ کر دیگئی تھی اور لوگ اسکی زیارت کو آتے تھے۔

اس لیے خواجہ کے دشمنوں کی کوشش اس وقت رائگاں گئی، لیکن ۴۵۵ھ میں طغرل بیگ کی موت ہوگئی اور الپ ارسلان اس کا جانشین ہوا، ایک بات پر ابو نصر کندری وزیر سے ناراض ہوکر اسے معزول کرکے نظام الملک طوسی کو منصبِ وزارت پر فائز کردیا، جو شافعی مسلک کا پیرو تھا، قلمدانِ وزارت سنبھالتے ہی اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اشعریوں کے خلاف کندری نے جو فرمان صادر کیا تھا اسے فسخ کرنے کا حکم جاری کردیا، چنانچہ جو اشعری اپنے وطن سے دور کردیے گئے تھے وہ واپس آگئے اور تبلیغ و تدریس میں پھر مشغول ہوگئے، نظام الملک نے دوسرا کام یہ کیا کہ ۴۵۷ھ میں بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم کردیا، جہاں اصولِ اشعری کے مطابق مذہب شافعی کی تدریس ہونے لگی، اسی قسم کے اور مدارس بھی بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان بصرہ، مرو، آمل، موصل وغیرہ میں قائم ہوئے، غرض یہ کہ اشعریوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع نصیب ہوگیا، یہ سمجھ کر کہ نظام الملک اشعری عقیدے کا حامی ہے، انھوں نے یہ کوشش کی کہ خواجہ انصاری کی مجلسوں پر پابندی لگادی جائے، لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہوئے ۴۵۶ھ میں الپ ارسلان مرو جاتے ہوئے راستے میں ہرات بھی آیا، نظام الملک طوسی بھی ساتھ تھا، مخالفین خواجہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاکر اس سے خواجۂ انصاری کی شکایت کی اور یہ درخواست کی کہ وزیر کے سامنے ایک مناظرہ ہو، انھیں اپنی کامیابی کا اسقدر یقین تھا کہ یہ شرط باندھی کہ اگر خواجہ عبداللہ مناظرہ میں غالب آجائیں تو یہ لوگ انکی پیروی کریں گے اور اگر غلبہ انھیں حاصل ہو تو خواجہ کے لیے ان کے عقائد کو تسلیم کرلینا ضروری نہیں ہوگا، البتہ آیندہ وہ مخالفت ترک کردیں گے اور خاموشی اختیار کرلیں گے جب خواجہ عبداللہ وزیر کے سامنے حاضر ہوئے اور انھیں اس مناظرہ اور شرائط کی اطلاع ملی تو جوش میں آکر بولے "میں مناظرہ ان چیزوں کے ذریعے کروں گا جو میری آستینوں میں ہیں"

نظام الملک نے پوچھا "آخر آپ کی آستینوں میں کیا چیزیں ہیں؟" خواجہ انصاری نے اپنی داہنی آستین کی طرف اشارہ کرکے جواب دیا "کتاب اللہ"، پھر بائیں آستین کیجانب اشارہ کیا اور کہا "اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!" ان کی داہنی آستین میں قرآن اور بائیں آستین میں صحیحین تھیں، جواب دیکر خواجہ نے اپنے مخالفین کی طرف نظر ڈالی، مطلب یہ تھا کہ بتاؤ کہ تمھارے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ خاموش رہے، کیونکہ ان میں سے کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ قرآن و حدیث کے ذریعے خواجہ انصاری کے ساتھ مناظرہ کرے،

مخالفینِ خواجہ بروقت تو خاموش و لاجواب ہورہے لیکن ان کی ریشہ دوانیاں کم نہ ہوئیں اور خواجہ انصاری کو ان سے مقابلہ و مدافعت کرنے کے لیے اور زیادہ سرگرم و آمادہ ہونا پڑا، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مخالفین کی ترقی سے دین اسلام کو سخت خطرہ پیدا ہوگیا تھا، وہ اپنی مجلسوں میں مخالفین کے عقائد کے خلاف اور زیادہ جوش سے تقریریں کرنے لگے، اور اس کے علاوہ ان کے رد میں متعدد رسالے بھی لکھ ڈالے، اشعریوں نے کوئی چارۂ کار نہ دیکھ کر حکومت کی طرف رجوع کیا اور خود نظام الملک نے جب وہ مرو میں تھا خواجہ انصاری کے بارہ میں غلط بیانی کرکے اس سے خواجہ انصاری کے ہرات سے اخراج کا فرمان حاصل کرلیا، انھیں یہ حکم ہوا کہ ہرات سے بلخ چلے جائیں۔ ہرات سے بلخ کا سفر بڑی تکلیف میں طے ہوا کیونکہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں لیکن ان کے لیے اطمینان و خوشی کی بات یہ ہوئی کہ ان کے شاگردوں اور مریدوں نے اس سفر میں ان کا اس طرح ساتھ دیا کہ انھیں گھوڑے پر سوار کرنے کے بجائے ان کے لیے ایک محمل تیار کیا اور اسی میں انھیں بٹھا کر اپنے کاندھوں پر اٹھا کر لے چلے، بلخ تک اسی طرح چار چار نفر باری باری سے محمل اپنے کاندھوں پر اٹھا کر چلتے رہے۔ بلخ میں ایک دوسری مصیبت

نازل ہوئی، وہ یہ کہ وہاں کے معتزلیوں نے خواجہ انصاری کو سنگسار کرنے کے واسطے سنگریزے
جمع کر لیے تھے۔ اُس زمانے میں نظام الملک کا بیٹا جمال الملک بلخ کا عامل تھا، جب اس کو
معتزلیوں کے اس ارادے کی خبر ملی تو وہ فوراً ان کے درمیان آ گیا اور انھیں بہت ملامت
کی کہ ایک دانشمند کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنا مناسب نہیں ہے، ان لوگوں نے کہا کہ
خواجہ انصاری کو کچھ بولنے کو کہیے، خواجہ انصاری نے ان کے کہنے سے لب کشائی کی اور
یہ آیت تلاوت کی:۔

اللہ نزّل احسن الحدیث کتابا متشابھا (سورۂ زمر آیت ۲۳)

اور اس کی تفسیر بیان کی جس میں انھوں نے غورجہ، غرجستان وفلانہ وتالقان کے معتزلیوں
پر لعن وطعن کیا، لیکن بلخ کے لوگوں کا تذکرہ اس مصلحت کی بناء پر نہیں کیا کہ عوام کے ہاتھ
فضول مارا جانا بیسود ہوگا۔

بلخ کے بعض نامور لوگوں نے خواجہ انصاری کی موافقت کی اور ان سے عزت واحترام
کا سلوک کیا، ان قدر دانوں میں ابوالقاسم تمیمی بھی تھے، جن کو نظام الملک نے مدرسۂ نظامیہ
بلخ میں تدریس کے لیے مامور کیا تھا، وہ بہت ہی با اثر اور مالدار شخص تھے، انھوں نے خواجہ
انصاری کو ہزار دینار جو ایک خاصی رقم تھی، تقدیم کیا،

ایک صوفی بزرگ بنام شیخ معمر لبنانی کو جو خواجہ انصاری سے عقیدت رکھتے تھے،
جب معلوم ہوا کہ نظام الملک نے خواجہ انصاری کی تبعید کا فرمان جاری کیا ہے تو وہ فوراً
وزیر کی خدمت میں پہنچے اور خواجہ انصاری کی شفاعت کی اور ان کو معاف کرنے کی درخواست
کی، نظام الملک نے شیخ لبنانی کی خوش روئی سے پذیرائی کی اور ان کی درخواست قبول
کرکے فرمان جاری کر دیا کہ خواجہ انصاری کو ہرات واپس بھیج دیا جائے، چنانچہ صرف چند ماہ

کی دوری کے بعد سال ۴۵۸ھ کے اختتام سے قبل خواجہ اپنے وطن واپس آ گئے۔

سال ۴۵۹ھ کے آغاز میں الپ ارسلان کو پھر ہرات آنے کا اتفاق ہوا اور مخالفین
خواجہ کو سازش کا ایک بار پھر موقع مل گیا، خواجہ انصاری کے دوستوں نے انھیں یہ مشورہ دیا
کہ وہ نظام الملک کے پاس جاکر جلاوطنی سے جلد رہائی دینے کے بارے میں اپنے امتنان کا اظہار کریں
خواجہ انصاری نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور ایک دن وزیر کے دربار میں حاضر ہوئے، مخالفین
خواجہ نے ان کو ذلیل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ بر سر دربار ان سے ایک سوال کریں، اگر وہ
جواب دینے میں تشدد ظاہر کریں تو نظام الملک کے روبرو ذلیل ہوں گے اور اگر ان کا جواب
سست ہوا تو اپنے شاگردوں کے درمیان رسوا ہوں گے، چنانچہ سلام وغیرہ کے بعد ایک
استاد شافعی بنام ابوالقاسم علی دبوسی نے جو بعد میں مدرسۂ نظامیہ بغداد میں مدرس بھی
مقرر ہوا، خواجہ انصاری سے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ سے ایک بات پوچھوں"، خواجہ انصاری
نے جواب دیا "کہو کیا کہتے ہو؟" اس نے کہا "آپ ابوالحسن اشعری پر لعن کیوں کرتے ہیں؟" دشمنوں
نے جو جال بچھایا تھا اس کی انھیں خبر نہ تھی، وہ چپ ہو رہے، نظام الملک نے نگاہ نیچی کر لی،
اسے خوب معلوم تھا کہ خواجہ انصاری کیا جواب دیں گے، جب وہ کچھ دیر تک خاموش رہے اور
تمام اہل مجلس ان کا جواب سننے کا انتظار کر رہے تھے، آخر نظام الملک نے کہا "سوال کا جواب
دیجئے"۔ خواجہ انصاری کو اب جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، بولے "میں اشعری کو نہیں جانتا،
میں تو اس پر لعنت بھیجتا ہوں جو خدا کے آسمان پر ہونے اور قرآن کے مصحف میں ہونے سے
انکار کرے اور جو پیغمبر زماں کے پیغمبر ہونے کو نہ مانے"۔ یہ کہکر خواجہ انصاری اٹھ کھڑے ہوئے
اور رخصت کی اجازت مانگی، اب کسی کی مجال نہ تھی کہ ان سے کچھ کہے، وہ چلے گئے تو نظام الملک
نے دبوسی اور اس کے ساتھیوں پر ناراضگی کا اظہار کیا اور خواجہ انصاری کے ساتھ جو بے ادبی

ہوئی تھی۔ اس کی تلافی کے لیے قبا لے کر ایک آدمی کو ان کے پیچھے دوڑایا کہ وہ انھیں ہدیۃً دیدے،
لیکن خواجہ نے قبول نہیں کیا اور وہ خیمۂ وزیر سے نکل کر شہر چلے گئے۔

مخالفین خواجہ انصاری کو نظام الملک کی طرف سے جسے وہ اشاعرہ کا حامی سمجھتے تھے سخت ناامیدی ہوگئی اور وہ اس فکر میں رہے کہ اب سلطان الپ ارسلان کی طرف رجوع کریں، اتفاق سے انھیں پھر یہ موقع مل گیا۔ سلطان ۴۶۲ھ کے آغاز میں پھر ہرات آیا، اس مرتبہ مخالفین، خواجہ انصاری کو بت پرست ثابت کرنے کی ایک ترکیب سوچ کر وہ ان کے پاس گئے، اور کہا کہ ہم لوگ سلطان کو سلام کرنے جارہے ہیں لیکن پہلے آپ کی خدمت میں سلام کرلیں، پھر سلطان کے پاس جائیں گے، انھیں ان باتوں میں الجھا کر پوشیدہ طور پر ایک بت خواجہ انصاری کے سجادہ کے نیچے رکھ دیا اور ان سے رخصت ہو کر چلے گئے، خواجہ کو انکی سازش کی کوئی خبر نہ تھی، وہ اپنے حجرہ میں چلے گئے۔ ادھر وہ لوگ جنھوں نے خواجہ انصاری کی ذلت و رسوائی کا نقشہ تیار کیا تھا، سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام و کلام کے بعد ان کی شکایت کی اور یہ تہمت لگائی کہ خواجہ انصاری خدا تعالیٰ کو صفاتِ بشری سے متصف کرتے ہیں اور اس کا بت بنا کر اپنے محراب میں رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدائے عزوجل اس بت کی شکل کا ہے، چنانچہ اس وقت بھی وہ بت ان کے سجادہ کے نیچے موجود ہے، کسی آدمی کو بھیج کر تحقیق کرلیا جائے، سلطان نے ان کی بات کا یقین کرلیا اور چند آدمیوں کو بھیجا کہ وہ بت لے آئیں، چنانچہ وہ مخفی طور پر خواجہ انصاری کے گھر پہنچے اور سجادہ کے نیچے سے نکال کر وہ بت لے آئے، سلطان بت دیکھکر بہت خشمگیں ہوا اور خواجہ انصار کو فوراً طلب کیا۔ خواجہ جب سلطان کے پاس حاضر ہوئے تو لوگوں کو مجمع اور بادشاہ کے سامنے ایک بت دیکھ کر انھیں سخت تعجب ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ الپ ارسلان نے غصے سے پوچھا "یہ کیا ہے؟" خواجہ نے جواب دیا یہ ایک بت ہے جو بیت کی طرح

مس کا بنا ہوا ہے"۔ سلطان نے کہا میں نے تو تم سے دوسرا سوال کیا تھا۔ خواجہ انصاری نے جواب دیا "سلطان مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" سلطان نے کہا "یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم بت پرست ہو اور کہتے ہو کہ خدا اس بت کی شکل کا ہے"۔ خواجہ انصاری نے رعب دار آواز میں کہا "کتنا عظیم بہتان ہے!" سلطان الپ ارسلان نے خواجہ انصاری کے صادقانہ لہجے اور ان کے پُروقار انداز سے سمجھ لیا کہ ان پر بہتان باندھا گیا ہے، حکم دیا کہ خواجہ ہرات کو عزت و احترام کے ساتھ ان کے گھر پہنچا دیا جائے، پھر مخالفین خواجہ کی طرف رخ کر کے کہا کہ "سچ سچ بتاؤ کہ تم نے ایسا کیوں کیا، ورنہ سخت سزا دیجائے گی"، انھوں نے جواب دیا کہ "ہم لوگ خواجہ انصاری کے ہاتھوں پریشان ہیں، سوچا تھا کہ اس طریقے سے ان کے شر سے نجات حاصل کرلیں گے"۔ الپ ارسلان نے ان سے تحریری معاہدہ لے لیا کہ "وہ جرمانہ کے طور پر خزانۂ سرکاری میں رقم دیں گے اور اس ذلت کے ساتھ موسیٰ رہائی پائیں گے"، دشمنوں پر اس طرح فتح حاصل کرنے سے خواجہ انصار کی عزت و حرمت میں اور اضافہ ہوا، کچھ دنوں کے بعد خلیفۂ بغداد القائم بامر اللہ نے ان کی قدر افزائی کے لیے ایک قبا بطور خلعت بھیجا، جسے پہن کر وہ مجلسِ تدریس میں شاگردوں اور مریدوں کے درمیان برسر منبر جلوہ افروز ہوتے تھے۔

۴۷۳ھ میں خواجہ انصاری کی عمر تقریباً ستر سال کی ہوگئی تھی، یہ زمانہ اُن کے عروج کا تھا، ان کی استادی و بزرگی اوج پر آگئی تھی، بار بار مخالفین کی سازشوں اور کینہ پروری و دسیسہ کاری کی وجہ سے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہوئے تھے، لیکن ہر بار انکے دشمنوں کو شکست نصیب ہوئی تھی، اور ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا گیا تھا، انکے ارادتمندوں اور احترام گزاروں کی تعداد بڑھتی گئی، خواجہ نظام الملک طوسی وزیر سلطان

اور قاضی صاعد ابن سیار ایسے اربابِ اقتدار سے ان کے خوشگوار تعلقات کی وجہ سے ان کے اثر و نفوذ میں بھی ترقی ہوئی، مفلسی و ناداری کا دور بھی ختم ہو چکا تھا، ان کے شاگرد و مرید ان کے پاس نذرانے اور ہدیے بھیجتے تھے، جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے، ان میں سے بقدر حاجت اپنے پاس رکھ کر دوسرے محتاجوں میں تقسیم کر دیتے تھے، مخالفوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے باعث سکون خاطر کے ساتھ مجالس و محافل میں تذکیر و تدریس میں مصروف رہتے تھے،

سلطان الپ ارسلان ماوراء النہر میں قتل کر دیا گیا تھا اور اس کا بیٹا ملک شاہ تخت نشین ہوا تھا، اس کے عہدِ سلطنت میں نظام الملک طوسی کی قوت و اقتدار میں زیادتی ہوئی، وہ صوفیوں کا عقیدتمند تھا، یہی سبب تھا کہ وہ خواجہ انصاری کا احترام کرتا تھا، اور اسکے سامنے جو ان کو رنج پہنچا تھا اس کی تلافی کی کوشش اپنی ملاقاتوں اور نذرانوں سے کرتا رہا،

مذہبی معاملات میں وہ کسی خاص فرقے کا حامی نہ تھا، تمام معاملات کو تدبر اور اصول سیاست سے حل و فصل کرتا تھا، مدرسۂ نظامیۂ بغداد قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ طریق سنت کو تقویت پہنچے، اس مدرسے کے امور کو وہ مصلحت کی بنا پر انجام دیتا تھا، جس مدرس کو چاہتا مامور کرتا اور جسے چاہتا معزول کر دیتا تھا، وہ سلطنت میں استحکام اور ملک میں امن وامان کا خواہاں تھا، تنازعات کو جلد طے کر دیتا تھا، بغداد میں شافعی مسلک کے لوگوں کی کثرت تھی، اس لیے وہ ان لوگوں کی طرفداری کرتا تھا، لیکن ہرات میں خواجہ انصاری کے عقیدتمندوں کی تعداد بیشتر تھی اس سبب سے بھی وہ ان کی تعظیم کرتا اور ان کے مخالفین کی کوششوں کو ناکام بنا دیتا تھا، خواجہ انصاری اربابِ سلطنت اور ارکانِ دولت سے جہاں تک ممکن تھا دور رہتے تھے، اور کسی کی مدح سرائی نہیں کرتے تھے لیکن نظام الملک نے ان پر احسانات کیے تھے جن کی وجہ سے خواجہ نے اس کی ستایش میں چند اشعار عربی میں کہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اسے نصیحت بھی کی تھی،

اسی سال یعنی ۴۷۳ھ میں خواجہ انصاری ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، انکی آنکھوں کی بصارت یک بیک جاتی رہی اور یہ نابینائی اُس وقت واقع ہوئی جب وہ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کر رہے تھے: "یکاد سنا برقہ یذھب بالابصار" (سورۂ نور آیت ۴۳) یعنی برق ان آنکھوں کی روشنی لے جاتی ہے۔ اس واقعہ سے ان کو اور ان کے مریدوں کو سخت صدمہ ہوا، بصیرت زائل ہونے کا سبب یہ تھا کہ وہ چراغ کی دھیمی روشنی میں رات رات کو جاگ کر حدیث شریف لکھا کرتے تھے، درحقیقت ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا، اور عرصے سے بینائی کم ہوتی جا رہی تھی لیکن اس کے بارے میں نہ کسی کو بتاتے تھے اور نہ علاج ہی کرتے تھے۔ آخر میں جب روشنی بالکل ہی زائل ہو گئی تو لوگوں کو معلوم ہوا، ان کے مرید و عقیدتمند اس افسوسناک حالت پر گریہ و زاری کرتے اور خدا سے بصارت پھر واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے،

بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود خواجہ انصاری نے تدریس و تذکیر کا کام جاری رکھا بلکہ اس معاملے میں زیادہ توجہ و محنت کرنے لگے، وہ اپنے شاگردوں کو حدیثیں لکھواتے اور اسکے بعد مسائلِ طریقت کی شرح اور پھر اشعار املا کراتے، اس سے پہلے یعنی بینائی زائل ہونے سے قبل بھی ان کا دستور یہی تھا کہ وہ اپنے اقوال و اذکار املا کراتے تھے،

خلیفۂ عباسی القائم بامر اللہ کا ۴۶۵ھ میں انتقال ہو چکا تھا اور اسکی جگہ المقتدی باللہ کو خلافت ملی تھی، وہ سلطان ملک شاہ کی بیٹی سے بیاہ کرنے کا خواہشمند تھا، چنانچہ بغداد سے وزیر فخرالدولہ اصفہان رشتہ طے کرنے آیا، مذاکرات کے درمیان نظام الملک نے تجویز پیش کی کہ جس طرح خلیفہ القائم بامر اللہ نے خواجہ ہرات کی تجلیل و قدر افزائی کی تھی، اس کے جانشین کو بھی پیر ہرات کی بزرگداشت کے لیے اقدام کرنا چاہیے، اس تجویز کو منظور کر کے خلیفہ نے ایک قبائے زریں بنام "شیخ الاسلام، شیخ شیوخ، زین العلماء، ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد الانصاری" اور ایک

دوسری قبا اس کے ساتھ خواجہ عبداللہ کے بڑے بیٹے عبدالہادی انصاری کے نام بھیجا، ہرات کے لوگوں اور مریدانِ خواجہ نے قبل ہی سے احتراماً انھیں شیخ الاسلام لقب دیدیا تھا، لیکن اب یہ لقب خلیفۃ المسلمین کی جانب سے عنایت ہونے کی وجہ سے رسمی ہو گیا۔

ماہ رمضان سال ۴۸۰ھ میں خواجہ عبداللہ انصاری پھر ناگہانی طور پر ایک آزمائش میں مبتلا ہو گئے، وہ واقعہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں ایک متکلم فلسفی ہرات آکر اپنے عقائد تبلیغ کرنے لگا، جب شیخ الاسلام کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے جلسوں میں اس کے خلاف تقریریں کیں، جن کو سنکر ان کے شاگردوں اور مریدوں کو غیرت آئی اور وہ غیظ و غضب میں فوراً اس مکان میں پہنچکر جہاں وہ متکلم فلسفی اقامت گزیں تھا، آگ لگادی اور اسے مارا پیٹا، وہ ہرات سے بھاگ گیا، اہل ہرات نے جلسہ کر کے شورش کو فرو کرنے کی کوشش کی لیکن خواجہ انصاری کے دشمنوں کو انھیں نقصان پہنچانے کا اچھا موقع ہاتھ لگ گیا، انھوں نے سارا الزام فتنہ و فساد کا انکے سر تھوپ دیا اور فوراً خواجہ انصاری کو بچوں اور ملازموں کے ساتھ اخراج کرنے کا ارادہ کر لیا، خواجہ مجبوراً سب کے ساتھ پوشنگ چلے گئے، جو ہرات سے ایک روز کی مسافت پر مغرب کی طرف واقع ہے، اتفاقاً وہ متکلم فلسفی بھی اسی شہر میں مدرسۂ نظامیہ کے استاد قاضی ابوسعید ابن یوسف کے مکان میں پناہ گزیں تھا جو کہ خواجہ انصاری کے ہمراہ گئے تھے، وہ اس مکان پر حملہ آور ہو گئے اور متکلم اور قاضی دونوں کو زدوکوب کیا اور شہر پوشنگ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، مدرسۂ نظامیہ کا دروازہ بند کر دیا گیا کیونکہ اس کا صحن خون آلودہ ہو گیا تھا، خواجہ انصاری کے ہوا خواہ لوگ ہرات واپس آگئے، اور شورش بند ہو گئی، خواجہ انصاری پوشنگ میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ اقامت گزیں تھے، اس دوران میں عاملانِ ہرات نے سلطان کے پاس واقعات کی رپورٹ بھیجی، اور یہ رائے ظاہر کی کہ خواجہ انصاری کی موجودگی میں شہر کے نظامِ عامہ کو خطرہ درپیش ہے اور شورش کو فرو کرنے

کے لیے ان کا فوراً شہر سے اخراج ضروری ہے، دو مہینے کے بعد ملک شاہ اور نظام الملک کا حکم نامہ آیا کہ خواجہ انصاری اور ان کے ساتھیوں کو فوراً ماوراء النہر کی طرف روانہ کر دیا جائے، وزیر کا فرمان جامع مسجد ہرات کے منبر پر سے پڑھ کر سنایا گیا جس سے خواجہ انصاری کے مخالفین کو بڑی شادمانی حاصل ہوئی اور خواجہ انصاری کو سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا کہ حالت نابینائی میں اپنے دوستوں کے ساتھ فوراً کوچ کریں، چنانچہ وہ اپنے رفقا کے ساتھ نیشاپور ہوتے ہوئے آمل کے راستے میں آمو ندی عبور کر کے بخارا جا رہے تھے کہ وزیر سلطان کا فرمان پہنچا کہ بلخ چلے جائیں، چنانچہ وہ پندرہ روز کی مسافت طے کر کے بلخ پہنچے جہاں انکے کئی عقیدتمند تھے، جنھوں نے عزت و احترام کے ساتھ انکی پذیرائی کی، زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ پھر فرمانِ سرکاری صادر ہوا کہ وہ مروالرود چلے جائیں، اس فرمان سے رفقائے خواجہ کو قدرے اطمینان ہوا کیونکہ مروالرود ہرات کی راہ میں ایک منزل ہے، یہاں دوسرا حکم پھر پہنچا کہ وہ ہرات کو لوٹ جائیں، چنانچہ ۴۸۰ھ کے موسم بہار میں جسے خواجہ انصاری بہت دوست رکھتے تھے، وہ اپنے رفقا کے ساتھ وطن کو واپس آگئے، اور یہاں پھر تدریس و تعلیم میں مصروف ہو گئے لیکن اب پیری ان پر غالب آگئی تھی، مسلسل حالتِ نابینائی میں مشقت نے انھیں خستہ و ماندہ کر دیا تھا، جسمانی طاقت بھی کم ہوتی جا رہی تھی، صحت خراب ہونے لگی تھی، ہر روز کسی نہ کسی مرض کا غلبہ ہوتا تھا۔ ان کے شاگرد و مرید و خویشاوند اور خود خواجہ انصاری کو یقین ہو چکا تھا کہ آخری وقت نزدیک آچکا ہے، آخر تاریخ ۲۲ ذی الحجہ روز جمعہ کو دوپہر سے قبل پچاسی ۸۵ سال کی عمر میں ۴۸۱ھ میں دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رحلت کر گئے، اور نوروز سے چند دن قبل ایک دن جبکہ سخت بارش ہوئی تھی، ان کے جسد خاکی کو ہرات سے ۳ کیلومیٹر اتر کی جانب قریۂ گازرگاہ میں زیر زمین دفن کر دیا گیا۔

شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کا مزار گازرگاہ میں زیارت گاہ عوام و خواص ہے، ان کی تربت کے قریب سب سے پہلے سلطان غیاث الدین محمد بن سام غوری (۵۵۸ - ۵۹۹ھ) کے عہد میں ایک عمارت مدرسہ کی صورت میں تعمیر ہوئی تھی، لیکن چنگیز کے حملوں کے زمانے میں یہ عمارت ویران ہوگئی، شاہرخ میرزا کے زمانے میں اسے از سرنو تعمیر کیا گیا اور کاشی کاری اور کتبوں سے اسکی تزئین کی گئی، شاہرخ میرزا کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی نے جب وہ درگاہ کے متولی اور یہاں گوشہ گیر تھے، ایک باغ لگوایا اور اس میں دو ۲ عمارتیں نمکدان کی شکل کی بنوائیں، جن میں سے مغرب کی عمارت سیلاب سے برباد ہوگئی، دوسری باقی ہے، یہ ایک ہشت پہل عمارت ہے، اس عمارت کے علاوہ مزار کے دکھن پورب طرف خانقاہ ہے، جس کی سقف زر محلول اور لاجورد سے مزین ہے، اور اس کی دیواروں پر آیات کلام اللہ خوشخط میں منقوش ہیں، مزار سے کچھ نیچے صحن میں خواجہ انصاری کے دو بیٹوں اور شاہ زادگانِ تیموری کی قبریں ہیں، جن کے لوح مزار میں نہایت خوشخط کتبے ہیں، راقم الحروف نے ہرات میں مزار خواجہ انصاری کی زیارت اور خانقاہ میں ایک مجلس سماع میں شرکت کی ہے۔

سطور صدر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے قارئین کو شیخ الاسلام حضرت خواجہ عبداللہ انصاری کی شخصیت و سیرت کا خاصا اندازہ ہوگیا ہوگا، پیر ہرات قرن پنجم ہجری میں جسے "دورِ تفتیش" کہا جاتا ہے زبردست و نمایاں شخصیت کے مالک تھے، ذہنی صلاحیتوں کے علاوہ وہ اپنی طبیعت و مزاج کے اعتبار سے بھی منفرد تھے، وہ محقق و مفسر و مفکر، حق آگاہ و حق پرست تھے، اور انھوں نے دین اسلام کی حقانیت اور اس کی اصلی روح کو عقلیت پرستی اور وسوسہ انگیزی سے آلودہ کرنے کی تمام کوششوں سے ایک سرفروش مجاہد کی طرح محفوظ رکھنے کا عزم کر رکھا تھا اور اس کے لیے انھوں نے جو راہ متعین کی تھی اس میں وہ بار بار مصائب و آزمائشوں میں گرفتار ہوئے، ایک زمانہ ان پر مفلسی و تنگدستی کا بھی گزرا لیکن انھوں نے تمام دشواریوں کا پامردی سے مقابلہ کیا، اور مستقل مزاجی سے اپنے مشن

پر قائم رہے، اس میں شک نہیں کہ ان کے مزاج میں سخت گیری، تعصب اور اختلاف میں شدت بھی تھی لیکن ان کی بنیاد نیک نیتی پر اور فی سبیل اللہ تھی، ان کا تمسک کلام اللہ، احادیث نبوی اور شریعتِ اسلام سے تھا، اور وہ آخر دم تک ان کی ترویج و اشاعت کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔

پیر ہرات کی تالیفات

جو تالیفات حضرت خواجہ انصار سے منسوب ہیں اُن میں زیادہ تر وہ ہیں جو انھوں نے خود تحریر نہیں کی تھیں، بلکہ تقریر کے ذریعے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو املا کرائی تھیں، ان املا شدہ کتابوں کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

(۱) **طبقات الصوفیہ**:۔ یہ کتاب سُلمی کی ہمنام کتاب (طبقات الصوفیہ بزبان عربی) کی توضیح و توسیع ہے، اپنے شاگردوں کو صوفیاے ماقبل کے حالات بیان کرتے وقت پیر ہرات نے اپنے مطالعہ سے بہت سے معلومات کا اضافہ کیا ہے، یہ تالیف لہجۂ ہراتی میں ہے، اسے مولانا جامی نے فارسی میں ترجمہ کرکے اپنی مشہور تالیف نفحات الانس کا ماخذ و اساس بنایا، طبقات الصوفیہ کو افغانستان کے دانشمند جناب عبدالحیٔ حبیبی نے ایڈٹ کرکے انجمنِ تاریخ افغانستان کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے۔

(۲) **صد میدان**:۔ یہ تصوف و عرفان کے متعلق ہے اور اس میں وہ سو ۱۰۰ منازل بیان ہوئے ہیں جن سے ایک سالک کو وصول الی اللہ میں گزرنا پڑتا ہے۔

(۳) **منازل السائرین**: یہ کتاب عربی میں ہے اور صد میدان کی توسیع ہے اس میں بھی وہی منازل سلوک زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، یہ کتاب اپنے موضوع و مطالب کے لحاظ سے بہت اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے علما، و عرفاء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، ان شارحین میں سے چند کے نام یہ ہیں، عفیف الدین تلمسانی، عبدالرزاق کاشانی، جمال الدین یحییٰ بن داؤد بن سلیمان الفارسی، شمس الدین محمد تستری،

محمد بن الحسن القادری، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم الجوزیہ، ہزار سالہ جشن سالگرہ کے
موقع پر یہ کتاب فارسی ترجمے اور حواشی کے ساتھ وزارتِ اطلاعات و کلتور جمہوریۂ افغانستان
کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔

(۴) **علل مقامات**: اس رسالے کا پورا نام یہ ہے، ذکر شئ من العلل التی
تدخل المقامات۔ یہ رسالہ بھی عربی ہے اور اس میں اُن علل کا بیان ہے جو مقاماتِ
سلوک میں داخل ہو کر سالک کی راہ کھوٹی کرتے ہیں۔

(۵) **رسالہ ذم الکلام واہلہ**: اس میں پیر ہرات نے آیاتِ قرآنی واحادیثِ نبویؐ سے
علم کلام اور اہل کلام کو سنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مخالف ثابت کیا ہے،

(۶) **کشف الاسرار و عدۃ الابرار**: یہ وہ تفسیر کلام اللہ ہے جو خواجہ نے اپنے شاگردوں
اور مریدوں کے درمیان تقریر کے ذریعے بتائی تھی، ان کے شاگرد ابی الفضل رشید الدین المیبدی
نے اسے اپنی تفسیر کی اساس بنائی، حضرت خواجہ نے اس تفسیر کے لیے ایک سو سات تفاسیر کا
مطالعہ اور ان سے استفادہ کیا تھا، اس تفسیر میں تین "نوبت" ہیں، نوبت اول میں خالص
ترجمہ ہے، نوبت دوم میں تفسیر اور نوبت سوم میں توجیہ و تاویل ہے، جس میں معرفت کے نہایت
جالب نکتے بیان کئے گئے ہیں، یہ تفسیر بھی ہراتی لہجے میں ہے، چند سال قبل دانشگاہ تہران نے
اسے طبع و نشر کیا ہے۔

(۷) **انیس المریدین** (۸) **شمس المجالس** (بزبان عربی) (۹) **واردات** (۱۰) **انوار التحقیق**
(۱۱) **الاربعین فی الصفات** (۱۲) **زاد العارفین** (۱۳) **مناقب الامام احمد بن حنبل**
(۱۴) **قلندر نامہ** (۱۵) **محبت نامہ** (۱۶) **نصیحت نامہ** (۱۷) **الٰہی نامہ** (۱۸) **مناجات نامہ**
(۱۹) **سوال دل از جان**۔

حضرت خواجہ کے رسائل کا ایک مجموعہ بنیاد فرہنگ ایران، تہران نے چھاپا ہے، جس میں
مختلف عنوانات پر بیالیس فصول ہیں۔

الٰہی نامہ اور مناجات بہت مشہور ہیں، ان میں حضرت خواجہ کی عارفانہ شان اور روحانی
مزاج پورے طور پر آشکارا ہے، اپنے خالق کے حضور میں جس صدق دل اور خلوص سے اپنی
تمنائیں اور آرزوئیں پیش کی ہیں وہ اس گفتگو کے مشابہ ہے جو عاشق و معشوق کے درمیان
ہو سکتی ہے، راز و نیاز کا انداز اور والہانہ سرشاری کی کیفیت قاری کے دل کو متاثر کیے بغیر
نہیں رہتی، حضرت خواجہ کی یہ تالیفات صرف عارفانہ و صوفیانہ نقطۂ نظر سے ہی اہم نہیں ہیں
بلکہ ادبی اعتبار سے بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے، انھوں نے نثر میں ایک خاص اسلوب
اختیار کیا جس کی مثال بہت کم ملے گی، اس میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی ہے، چھوٹے
جملے اور فقرے ہیں جو مسجع و مقفی ہیں، اور ان سے ایک ایسا آہنگ پیدا ہوتا ہے جو سامع
کے لیے لطف و لذت کا سامان پیدا کرتا ہے، لیکن قافیہ پیمائی میں تصنع نہیں ہے، بلکہ ایک
خاص قسم کی لطافت و شیرینی ہے، خواجہ نے اپنے مریدوں و شاگردوں کا خیال کر کے سادگی
کا پیرایہ اختیار کیا تاکہ وہ بھی لطف اندوز ہو سکیں، چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

الٰہی
اگر کار بہ از خدمت خاستی
پسر عمران بطالب ارنی کی برخاستی
واگر نہ ترا ایں معنی بایستی
محمد مصطفیٰؐ قاب قوسین را نشایستی
بوجہل از کعبہ و ابراہیم از بتخانہ
کار عنایت دارد باقی ہمہ بہانہ

ابراہیم را چہ زیاں کہ پدر او آذر است؟
آذر را چہ سود کہ ابراہیم اورا پسر است؟
نور در طاعت ست اما کار بعنایت است
آنجا کہ عنایت خدا ای باشد
فسق آخر کار پارسای باشد
وآنجا کہ قہر کبریای باشد
سجادہ نشیں کلیسای باشد

الٰہی
اگر با تو سازم گویی که دیوانه است
اگر با خلق در سازم گویی بیگانه است
الٰہی
فرمایی که بجو و می ترسانی که بگریز
فرمایی که بخواه و می گوئی بپرهیز
الٰہی
گریخته بودم تو خواندی
ترسیده بودم بر خوان تو نشاندی
ابتدا می ترسیدم که مرا بگیری به عطای خویش
اکنون می ترسم که مرا بفریبی به عطای خویش
الٰہی
نه خرسندم نه صبور
الٰہی
نه رنجورم نه مهجور
الٰہی
تا با تو آشنا شدم از خلایق جدا شده ام
در جهان شیدا شدم
نهان بودم پیدا شدم

الٰہی
بر امید وصل چندان اشک باریدم
که بر آب چشم خویش تخم درد بکاریدم
در سعادت ازلی در یابم
این درد پسندیدم
در دیدهٔ من روزی بر تو آید
آن محنت همه دولت انگاریدم
الٰہی
از بد سزای خود در دردم
و از ناکسی خود بفغان!
درد را درمان ساز!
ای درمان ساز همه دردمندان!
ای پاک صفت از عیب
ای عالی صفت از شوب
ای بی نیاز از خدمتِ من
الٰہی
در الٰہیت یکتایی
و در احدیت بی همتایی
و در ذات و صفات از خلق جدایی

متصف به بهایی
متحد به کبریایی
مایهٔ هر بینوا و پناه هر گدایی
همه را خدایی
تا دوست کرایی

در چشم منی روی بمن ننمایی
و اندر دلی هیچ بمن نگرایی
ای جان و دل و دیده و ای بینایی!
چون از دل و دیده در کنارم نایی!

لسانی لحاظ سے بھی حضرت پیر ہرات کی تالیفات کی خاصی اہمیت ہے، کیونکہ وہ خالص فارسی (یا دری) میں ہیں، جو پانچویں صدی ہجری میں خراسان کے علاقے میں رائج تھی، ان تالیفات میں کثرت سے پرانے الفاظ و محاورات ہیں جو اب استعمال میں نہیں رہے، حضرت خواجہ نے طبقات صوفیہ اور تفسیر میں خاص طور پر صریح و دقیق الفاظ استعمال کیے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوا ہے عربی الفاظ و امثال و حکم سے پرہیز کیا ہے۔

خواجہ انصار ذوق شعری سے بھی سرشار تھے، ان کی رباعیاں عرفانی اور اخلاقی مضامین سے لبریز اور شور و حال و جذب و کیف سے مملو ہیں۔

حضرت پیر انصار کے اہل و عیال کے متعلق اطلاعات بہت کم دستیاب ہیں۔ انکے دو بیٹوں کے نام البتہ معلوم ہیں، ایک شیخ اسمٰعیل اور دوسرے شیخ عبدالہادی، ان دونوں کی قبریں گازرگاہ میں خواجہ کے مزار کے پہلو میں واقع ہیں، لیکن حضرت خواجہ کے احفاد اکثر بلاد و امصار میں پھیل گئے تھے، خواجہ الطاف حسین حالی اور خواجہ حیدر علی آتش کا سلسلۂ نسب حضرت خواجہ عبداللہ انصاری سے ملتا ہے، فرنگی محل لکھنؤ کا انصاری خاندان بھی حضرت پیر ہرات سے اپنا سلسلہ ملاتا ہے، ان کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی خاندان ہیں جو حضرت پیر ہرات سے منسوب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، واللہ اعلم۔ افغانستان کے ایک اسکالر جناب آقا ی

علی اصغر بشیر، حضرت خواجہ کے اولاد و احفاد کے متعلق معلومات جمع کر رہے ہیں، چنانچہ جب میں نے کانفرنس میں اپنا مقالہ پڑھا اور اس میں خواجہ حالی کا ذکر آیا تو انھوں نے بڑی دلچسپی ظاہر کی اور مجھ سے فرمایش کی ہے کہ میں ہندوستان کے انصاری خاندانوں کے متعلق بحفیں انھیں معلومات فراہم کر دوں۔

کتابیات

(۱) طبقات الصوفیہ (کابل ایڈیشن)

(۲) منازل السائرین (” ”)

(۳) نفحات الانس جامی (تہران ایڈیشن)

(۴) مقامات شیخ عبد اللہ انصاری۔ جامی (کابل ایڈیشن)

(۵) الٰہی نامہ (کابل ایڈیشن)

(۶) مناجات نامہ (” ”)

(۷) رسائل خواجہ عبد اللہ انصاری (تہران ایڈیشن)

(۸) ریاض العارفین (تہران ایڈیشن)

(۹) رسالہ ادب۔ دانشگاہ کابل (شمارہ ۱ جلد ۲۴۔ مارچ، مئی ۱۹۷۶ء)

(۱۰) رسالہ افغانستان (انگریزی) شمارہ ۱ جلد ۲۸ بابت جون ۱۹۷۵ء)

بہمنیوں سے پہلے دکن کی ایک اہم فارسی تصنیف

فرہنگ دستور الافاضل

از پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

دکن کے فارسی ادب سے متعلق نئے مخطوطات کی بازیافت سے یہ بات مسلّم ہو جاتی ہے کہ ابھی اس سلسلے کی تحقیق اپنی آخری منزل تک نہیں پہنچی ہے (History of midieval Dicaan) کی دوسری جلد میں ”دکنی فارسی ادب“ کے عنوان سے راقم کا مقالہ شامل ہے، ابھی اس حصے کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ مجھے دو نئی تصانیف کا سراغ ملا، اول فارسی زبان میں موسیقی پر ایک رسالہ توضیح الالحان نامی تھا جو محمود شاہ بہمنی کے نام معنون تھا، بظن قوی سلطان مذکور بہمنی دور کا آخری بادشاہ تھا، جو ۷۸۰ھ میں تخت نشین ہوا تھا، اس رسالے کا مخطوطہ تہران میں آقای نصیری کے کتابخانے میں ہے جس کو ہمایوں فرخ نے مجلۂ ہنر و مردم کے دو شمارں ج ۹۴ اور ج ۵۹ میں متعارف کرا دیا ہے، راقم نے اس کتاب پر ایک مختصر یادداشت تیار کی جو بعد میں تاریخ دکن والے مضمون میں شامل کر دی گئی، دوسری تصنیف شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی (م: ۸۳۴) کی سوانح حیات سے متعلق تھی، اس کا مؤلف عبد العزیز بن شیر ملک واعظی تھا جس نے بہمنی سلطان علاء الدین احمد (۸۳۸ - ۸۶۲) کے نام یہ رسالہ معنون کیا تھا، اس رسالے پر راقم نے ایک یادداشت تو تیار کر لی تھی لیکن اس وقت تک تاریخ دکن

چھپ چکی تھی، چنانچہ مکمل یادداشت تو میرے مضمون میں شامل نہیں ہوسکی البتہ اسکا چند سطروں میں خلاصہ بطور ضمیمہ تاریخ مذکور میں شامل ہوگیا جس میں غلطی سے عبدالعزیز کے بجائے مصنف کا نام عبداللہ درج ہوگیا ہے، البتہ مکمل مضمون رسالہ اسلامک کلچر جولائی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا ہے، اس کے بعد مجھے چند اور نسخوں تک رسائی ہوئی جن کے ذکر سے تاریخ دکن والا مضمون خالی ہے، ان میں سے ایک دیوان عیانی، دوسرا فتح نامہ محمود شاہی ہے جو آخری بہمنی سلطان محمود شاہ کے دور سے تعلق رکھتا ہے، یہ ایک منظوم رسالہ ہے جس کا مصنف بھی نعمت اللہ عیانی ہی ہے، یہ دونوں نسخے Govt. Oriental MSS Lib مدراس میں زیر شمارہ ۹۲ محفوظ ہیں، تیسری کتاب "تاریخ حبیبی و تذکرۂ مرشدی" ہے، اس کا بھی مولف عبدالعزیز ابن شیر ملک واعظی صاحب "رسالہ در سیر شاہ نعمت اللہ ولی" ہے، تاریخ حبیبی علاء الدین احمد شاہ بہمنی (م: ۸۶۲) کے عہد میں اس کے وزیر ملک راجا رستم کی فرمائش پر ۸۴۹ھ میں مرتب ہوئی، یہ تاریخ حضرت گیسودراز کے حالات کا مفصل تذکرہ ہے، مصنف نے اس کے تمام مندرجات سید سدید الدین حسینی کی سند سے لکھے ہیں،

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا رستم جو سلطان علاء الدین احمد کے زمانے میں نظام الملک کے لقب سے ملقب تھا، سادات اور غیر ملکیوں کا سخت مخالف تھا، چنانچہ اس بادشاہ کے دور میں چاکنہ میں جو قتل عام ہوا اور جس میں بقول برہان مآثر ص ۸۴ بارہ سو صحیح النسب سادات اور ایک ہزار غیر ملکی قتل ہوئے، راجا رستم کا ہاتھ تھا، اس کے باوجود راجا رستم سید گیسودرازؒ کا معتقد تھا، چنانچہ تاریخ حبیبی و تذکرۂ مرشدی کی تالیف اسی کے اسی اعتقاد کا نتیجہ ہے۔

تاریخ حبیبی حسب ذیل دس[5] ابواب پر مشتمل ہے:۔

[5] ابواب کی تفصیل بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے نسخے پر مبنی ہے، جس کو اسکے فہرست نگار، ایوانوف نے درج کی ہے۔

(باقی ص ۳۱ پر)

باب اول مبالغت کرامات و خوارق،

باب دوم مواظبت دینداری،

باب سوم معالجت مرض قلوب،

باب چہارم موافقت عقیدۂ پاک با حکام سنت و جماعت،

باب پنجم معاملات در عطف خلافت و اجازات،

باب ششم مناسبت فضائل بنائ مخدوم،

باب ہفتم مباحثت و ارادت در علوم و نویسانیدن تصانیف،

باب ہشتم ملاحظت در عرائس و ضیافات،

باب نہم مداخلت در سماع طریقت و سماع بحالات،

باب دہم مداومت بوردو ظاہر آن عارف حق الحقیقہ،

اس کتاب کے تین نسخے دریافت ہوئے ہیں، ایک بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں جس کا تعارف ایوانوف نے اپنی فہرست میں کرایا ہے، دوسرا نسخہ مسلم یونیورسٹی کے کتابخانہ میں حبیب گنج کے ذخیرہ میں زیر شمارہ ۳۸/۲۲ موجود ہے، یہ چھوٹے سائز کے ۱۵۳ ورق پر مشتمل ہے، آخری ورق اور مقدمے کا ایک ورق غائب ہے، تیسرا نسخہ سید عطا حسین صاحب کے پاس تھا، چنانچہ اس سلسلے سے سید صاحب موصوف نے مولانا حبیب الرحمٰن نواب صدر یار جنگ کو دو خط حیدرآباد لنگم پلی سے ۱۶ جنوری ۱۹۴۶ء اور ۱۶ مارچ ۱۹۴۶ء کو لکھے، اول الذکر خط سے معلوم ہوا کہ سید عطا حسین نے اپنے نسخے کا مقابلہ نواب صدر یار جنگ کے نسخے سے (جو اب مسلم یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے) کر لیا تھا، پھر ان کو کلکتے کے نسخے کا علم ہوا تو اس کی نقل کی فکر ہوئی، دوسرے خط سے ظاہر

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰) مسلم یونیورسٹی کا نسخہ اس تفصیل کا حامل نہیں، البتہ اسکے اردو ترجمے میں یہی ابواب ملتے ہیں۔

ہوتا ہے کہ اس وقت تک ان کو عکس مل گیا تھا، چنانچہ اس کی رو سے انھوں نے حبیب گنج کے نسخے کے لیے آخری صفحہ کی نقل بھیجکر اس کا ایک بڑا نقص پورا کر دیا لیکن مقدمہ میں جو کمی تھی وہ ہنوز باقی ہے، ایسا خیال ہوتا ہے کہ سید عطا حسین صاحب تاریخ حبیبی کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر نہ جانے کن وجوہ سے یہ کتاب شائع نہ ہو سکی، البتہ نواب معشوق یار جنگ نے اس کو اردو میں منتقل کر دیا تھا، چنانچہ یہ ترجمہ حیدرآباد سے ۱۳۶۸ ہجری میں شائع ہوا، اس کے دیباچے سے معلوم ہوا کہ شیخ علاء الدین جنیدی سجادہ نشین روضۂ شیخ سراج الدین رکن الدین تاریخ حبیبی کے متن کی تصحیح کر کے چھاپ رہے تھے، مگر معلوم نہ ہو سکا کہ اس کی طباعت مکمل ہوئی یا نہیں، اور یہ بھی معلوم نہیں کہ شیخ مذکور کے نسخے کی بنیاد کس نسخے پر تھی، خیال یہی ہے کہ شیخ علاء الدین اور سید عطا حسین دونوں کا بنیادی نسخہ ایک ہی ہوگا۔

راقم نے تاریخ دکن والے مضمون میں ایک فارسی شاعر نظیری طوسی کا ذکر کیا ہے، لیکن اس وقت تک اس کے دیوان کا سراغ نہیں ملا تھا، اب اس کے ایک نسخے کا علم ہو گیا ہے، یہ نسخہ ایک مختصر دیوان کی شکل میں برٹش میوزیم کے ایک فارسی مجموعہ زیر شمارہ Add. ۷۹۳۰ موجود ہے، جس کا تعارف ریو نے فارسی مخطوطات کی فہرست ج ۲ ص ۶۴۱ - ۶۴۲ پر کرا دیا ہے، دیوان مذکور اس مجموعے کے ۱۸۱ تا ۲۲۱ اوراق پر مشتمل ہے، جس کے اجزا حسب ذیل ہیں:-

قصائد ورق ۱۸۱ بعد - غزل ورق ۲۰۴ بعد - مقطعات ۲۱۲ بعد - رباعیات ورق ۲۱۶ بعد

اس دیوان کے قصائد شاہ خلیل اللہ[1] اور انکے دو فرزند شاہ حبیب اللہ اور شاہ محب اللہ کی مدح میں ہیں۔

---

[1] شاہ خلیل اللہ شاہ نعمت اللہ ولی کرمانی (م: ۸۳۴) کے بیٹے تھے، باپ کی وفات کے بعد دکن آئے اور احمد شاہ بہمنی (م: ۸۳۸) اور علاء الدین بہمنی (م: ۸۶۲) کے دور میں ان کی اور ان کے دو بیٹوں کی بڑی قدر و منزلت ہوئی لیکن ہمایوں شاہ کے دور میں ۸۶۴ میں شاہ حبیب اللہ قتل کر دیے گئے۔

ادھر کافی عرصے سے راقم حروف کے زیر مطالعہ فارسی لغت کا ایک مخطوطہ دستور الافاضل کا رہا ہے، اس کے غائر مطالعے سے اس راز کی عقدہ کشائی ہوئی کہ یہ فرہنگ بہمنی دور سے قبل دکن میں مرتب ہوئی، اس کتاب کا واحد اور کسی قدر ناقص مخطوطہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتاب خانے میں محفوظ ہے، راقم نے اس کا انتقادی متن مع ایک مفصل مقدمے کے دو سال قبل ۱۳۵۲ شمسی میں بنیاد فرہنگ ایران تہران سے شائع کر دیا ہے، لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ باوجود اس علم کے کہ دستور الافاضل قصبہ استادآباد میں مرتب ہوئی، میں اس امر کی طرف متوجہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ ان چند قدیم کتابوں میں ہے جو سلطنت بہمنی کی تاسیس سے قبل خطۂ دکن میں لکھی گئی تھیں، اسی وجہ سے اس فرہنگ کا ذکر تاریخ دکن والے مضمون میں نہیں ہوا تھا، اس نقص کی تلافی کا خیال ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔

اس تمہید کے بعد اب میں دستور الافاضل کے بارے میں ایک مختصر گذارش پیش کر رہا ہوں۔

دستور الافاضل فارسی لغت کی ابتدائی کتابوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، قدامت کے لحاظ سے ہندوستان میں صرف فرہنگ قواس (تالیف بعد ۶۹۵)، اس سے پہلی کی تالیف ملتی ہے، اور ایران میں بھی صرف دو فرہنگیں اس سے قدیم موجود ہیں، یعنی لغت فرس تالیف اسدی (بعد ۴۶۵) اور صحاح الفرس تالیف محمد بن ہندوشاہ نخجوانی (۷۲۸)، معیار جمالی اسی کی ہم عصر ہے۔

دستور الافاضل کے مولف کا اصل نام رفیع تھا لیکن وہ حاجب خیرات کے نام سے معروف تھا، اس کی زندگی کے بارے میں کوئی معلومات نہیں، البتہ اس نے خود دستور الافاضل کے مقدمے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی کا باشندہ تھا، یہیں اس کی نشو و نما ہوئی لیکن کچھ ایسے حادثات پیش آئے کہ اس کو وطن چھوڑنا پڑا، اسی پریشانی

کے عالم میں وہ دکن کی طرف روانہ ہوا، اور قصبہ بیر پہنچا، یہاں اس خطے کے صدر شمس الدین محمد کی آمد آمد تھی، حاجب خیرات اس کے دربار میں پہنچا، صدر مذکور نے توجہ فرمائی اور اس کو اپنے مستقر استاد آباد آنے کی فرمایش کی، مولف صدر کے ہمرکاب روانہ ہوا اور استاد آباد پہنچ گیا، اس طرح صدر کے دربار میں اس کی باقاعدہ رسائی ہوئی، اور وہ اسکی عنایات سے مخصوص ہوا، ایک روز صدر نے اس سے ایک فرہنگ لکھنے کی فرمایش کی، مولف نے فرہنگ قواس کا ذکر کیا لیکن صدر نے اس کے اختصار کے پیش نظر اصرار سے فرہنگ مرتب کرنے کی خواہش ظاہر کی، چنانچہ حاجب خیرات نے ۷۴۳ھ میں اپنا لغت دستور الافاضل کے عنوان سے مرتب کر کے صدر شمس الدین محمد کے نام معنون کیا،

مولف کا نام اس عبارت میں پایا جاتا ہے :-

اما بعد می گوید مولف این تالیف و مصنف این تصنیف بندۂ ضعیف رفیع کمن اندوہ وبلیات معروف بہ حاجب خیرات -

حسب ذیل بیت میں مشہور نام اس طرح آیا ہے :-

کسی کا این عین نسخہ باز جوید   دعای حاجب خیرات گوید (ص ۲۵۶)

بظاہر حاجب خیرات میں اضافت ابنی ہے -

کتاب کا عنوان اور سنہ تاریخ اس بیت میں شامل ہے :

ز ہجرت بود ہفصد با سہ وچہل   مرتب گشتہ دستور افاضل

مولف کے سفر میں دو قصبوں کا نام آیا ہے، ایک "بیر" دوسرا "استاد آباد (دستور ص مقدمہ)

ان دونوں مقامات کے تعین ہی پر اس گفتگو کے عنوان کی صحت کا مدار ہے، دراصل ان ہی جگہوں سے راقم نے قیاس کیا ہے کہ حاجب خیرات نے تلاش معاش میں دہلی سے دکن کا رخ

کیا تھا، اور اس طرح کی یہ واحد مثال نہیں بہمنی سلطنت کے قیام کے پہلے اور دوران قیام میں شمالی ہند کے علماء و فضلاء برابر دکن جایا کرتے تھے، شیخ راجو قتال، شیخ حسن دہلوی، سید گیسو دراز کا نام اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے، بہر حال حاجب خیرات قصبہ "بیر" پہنچا، جو ہندوستانی تلفظ میں بیڑ ہے، لیکن حاجب نے اس کا عربی وایرانی قاعدے سے "بیر" بمعنی چاہ کیا ہے، جیسا کہ حسب ذیل فقرے سے واضح ہے :

"وچند روز چون یوسف خود را بدان چاہ [یعنی بیر] زندان بلی داد داد" (ص ۴)

اگر چہ آفتاب در چاہ نیفتد در منزل بیر فرود آمد [ص ۵۰]

"بیڑ"[1] نام کے دو قصبے اس وقت بھی نواح دکن میں موجود ہیں، ایک ضلع نیماڑ میں ہے جو کھنڈوا سے بطرف اٹارسی ۳۳ کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے، دوسرا "بیڑ" جو ریاست حیدر آباد میں شامل تھا اور اب صوبہ مہاراشٹر کا جزء ہے، قیاس یہی ہے کہ حاجب خیرات ریاست حیدر آباد میں شامل بیڑ میں پہنچا ہوگا، اس لیے کہ یہ قصبہ استاد آباد کے نواحی میں تھا، اور استاد آباد اس خطے کا صدر مقام تھا، یہ قصبہ بہمنیوں کے دور میں دار الملک کی حیثیت رکھتا تھا، کئی واقعات اس خطے سے منسوب تاریخوں میں ملتے ہیں، منجملہ ان کے ایک مشہور واقعہ جو برہان مآثر (ص ۹۲-۹۳) میں درج ہے، یہ ہے کہ سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع چند اکابر امراء کے بیدر میں محبوس تھے، شاہ مذکور کے مریدوں کی وجہ سے شورش ہوئی اور ہزاروں آدمیوں نے قلعہ کا دروازہ توڑ کر انھیں آزاد کرادیا، آزادی کے بعد یہ جماعت دار الملک بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی.

حاجب خیرات کے سفر کے سلسلے کا دوسرا مقام استاد آباد ہے. یہ نام اب مفقود ہے -

---

[1] بیڑ بہمنیوں کے زمانے میں ایک دار الملک تھا، چنانچہ جب سلطان ہمایوں شاہ کے زمانے میں شاہ حبیب اللہ مع تمام امراء کے قید سے رہائی پائی تو یہ جماعت ولایت بیڑ کی طرف متوجہ ہوئی (تاریخ برہان مآثر ص ۹۲-۹۳)

لیکن یہ قصبہ گلبرگہ کے نواحی میں تھا، مرحوم ڈاکٹر غلام یزدانی کا خیال ہے کہ استاد آباد
شاہ پور کا پرانا نام تھا، لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے نزدیک گوگی کا پرانا نام استاد آباد
تھا، دراصل گوگی میں ایک کتبہ برآمد ہوا ہے، یہ کتبہ قصبہ استاد آباد کے ایک قلعہ سے تعلق رکھتا
ہے جس کی بنیاد محمد بن تغلق شاہ (۲۵ - ۷۵۲) کے دور میں ۷۳۸ ہجری رکھی گئی تھی، یہ کتبہ
ڈاکٹر غلام یزدانی صاحب نے ۳۲ - ۱۹۳۱ کے Epigraphic muslimee
میں شائع کیا ہے، اس کتبے کے جو اجزا پڑھے جاسکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہیں:

۱۔ حصن حصین و شکر متین مرغدا برای در عہد پادشاہ آفتاب آثار و ماہ انوار
وز حل اقتدار عطارد شعار قطب فلک مملکت ...... [محمد] بن تغلقشاہ شید اللہ
...... دولتہ بزوالہ توفیق بنا، حصار خطۂ استاد آباد کی کوکبۂ کنگرۂ بلند
او با برج فلک

۲۔ ہم پہلوست و برج با ثبات او با سیارات گردوں ہم باز و بمثل
کوہی است کہ تیغ خورشید کمر گیر [د] ...... [آب] دریا
رفعت و اساس خاک ریز ...... [ش] دروازہ او مفتاح
ابواب جنان درباره کی در باب بانی او معمار

۳۔ قلعہ دین و ایمان فرمود من بنی حصناً للہ للاسلام بنی لہ قصوراً
[خا] ن اعظم خاقان معظم ...... معالیا و حجل لہ الکرام
موالیا گردانید بتاریخ الغرۃ

۴۔ من ذی الحجہ سنۃ ثمان و ثلاثین و سبع مایۃ بکار فرمائی ضیا ..
.... خطۂ مذکورہ مدت اعمار ما
عمارت شد

اس کتبے سے ظاہر ہے کہ ۷۳۸ میں استاد آباد ایک قصبے کی حیثیت رکھتا تھا،
خلاصہ یہ کہ استاد آباد جو صدر شمس الدین محمد کا مستقر تھا اور جہاں صاحب خیرات نے اپنی
فرہنگ دستور الافاضل مرتب کی تھی، وہ موجودہ گوگی یا شاہ پور کا قدیم نام تھا، جو گلبرگہ
سے ۵۰ کلومیٹر جنوب غرب میں واقع تھا، فاضل معاصر ڈاکٹر ڈیسائی کا خیال ہے کہ
دیوگیر کا اس دور کا صوبہ دار ملک الشرق قوام الدین قتلغ خاں محمد بن تغلق شاہ کا
استاد رہ چکا تھا، قصبہ استاد آباد کا یہ نام اسی مناسبت سے تجویز ہوا ہوگا۔

بہرحال یہ مسلم ہے کہ استاد آباد محمد تغلق کے دور میں دکن میں سیاسی اہمیت کا قصبہ
تھا جس کی حیثیت خطے کے صدر مقام کی تھی، اسی قصبے میں فارسی کا مشہور لغت دستور الافاضل
تالیف ہوا، اس بنا پر دکن کی ان چند فارسی کتابوں میں جو بہمنیوں کے اقتدار میں آنے
کے قبل تالیف ہوئی تھیں، اس کو سب سے زیادہ اہمیت و شہرت حاصل رہی ہے،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحب خیرات کے ممدوح صدر شمس الدین محمد کے بارے
میں کچھ عرض کیا جائے، یہ بات واضح ہے کہ اس صدر کا ذکر کسی تاریخ میں موجود نہیں،
جو کچھ دستور الافاضل کے مقدمے میں درج ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل صدر
کا نام محمد اور لقب شمس الدین تھا، اس کا باپ احمد بن علی تھا اور وہ ججنیری تھا، خود
مولف کے بیان کے چند جملے ملاحظہ ہوں

آسوا دبار یک قصبۂ بیر کرنی غیابت الجب عبارت از آنست نزول افتاد
و چندروز چوں یوسف خود را بداں چاہ زنداں بلی داد داد ..... ناگاہ صبح
اجلال از مطلع اقبال طالع شد و صدر صدور الشرق شمس الدولۃ والدین
.... صدر با قدر، افضل فضلاء روی زمین، اکمل شعراء ہند و چین، منفق نفقۂ غرباء

مربی علماء و بلغاء، مکرم کرماء عصر، منشی نظم و نثر... شمس الدولہ والدین عزّ الاسلام والمسلمین قرۃ عین الوزراء المتقدمین ضیاء الملوک والسلاطین مخصوص بعنایت باری محمد احمد ججنیری۔

گوہر پاک احمد بن علی — صدر آفاق شمس دولت و دین
نثر طبعت ہمہ در منثور — نظم الفاظ تست در ثمین
ہمہ اشعار تو پر آبِ زلال — ہمہ ابیات تست ماء معین
رشک درہای لفظ تو ہر سال — در پس پردہ می شود پروین
تا بگردوں مسخر قلمت — باد دایم ز فضلِ حق آمین

بظاہر شمس الدین محمد صدر استاد آباد محترم خانوادے کا رکن تھا، اس کے باپ احمد ابن علی کا شمار اس دور کے بڑے امراء میں تھا، حال ہی میں ایک کتبہ ملا ہے جو احمد بن علی ججنیری کے توسط سے ۷۲۷ ہجری میں تیار ہوا تھا، یہ کتبہ فی الحال ضلع بیدر کے قصبہ کلیانی میں موجود ہے، اس کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد بن علی نے محمد بن تغلق شاہ کے دور میں ملک الشرق قوام الدین قتلغ خاں کے عہد وزارت میں ایک مسجد بنوائی تھی، یہ کتبہ Indian E Pigrphy annual Rpt ۱۹۶۵ کے صفحہ ۱،۲ پر شائع ہوا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

۱- یا اللہ امر ھذہ العمارۃ المسجد المبارکۃ المیمونۃ الشریفۃ فی عہد سلطان السلاطین

۲- یا اللہ ظل اللہ فی العالمین ابو المجاہد فی سبیل اللہ محمد بن تغلق شاہ

۳- یا اللہ السلطان خلد اللہ ملکہ وسلطانہ واعلی امرہ و شانہ و در نوبت اقطاع ملک

۴- یا اللہ الشرق قوام الدولۃ والدین وزیر اقلیم دیوگیر مکنہ اللہ بندہ الضعیف النحیف الراجی الی رحمۃ

۵- یا اللہ تعالی والغفران احمد علی ججنیری بتاریخ الغرۃ من صفر ختم اللہ بالخیر والظفر سنۃ ست وعشرین وسبعمایہ

قطعہ

ہستی ہمہ در راہ تو خواہم کردن
آنرا کہ تو ہستی چہ کم آید ہستی

یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ مسجد کا بانی احمد علی شمس الدین محمد صدر کا باپ تھا، اس کے قرائن حسب ذیل ہیں:-

۱- دستور الافاضل میں شمس الدین کے باپ کا نام ایک بار احمد بن علی لکھا ہے، اور دوسری بار خود صدر کے نام کے ساتھ محمد احمد کی شکل میں ملتا ہے، اور کتبہ میں بانی مسجد کا نام احمد علی بطور اضافت ابنی نقل ہے یعنی احمد بن علی، پس دونوں ناموں کی یکسانی دونوں کے ایک ہونے کا قوی قرینہ ہے۔

۲- دونوں کا زمانہ ایک ہے، شمس الدین ۷۴۳ھ میں استاد آباد کا صدر تھا، اگر ۱۶ سال قبل ۷۲۷ میں اس کا باپ کلیانی یا اس کے نواح میں مسجد کی بنیاد ڈال رہا ہو تو عین قرین قیاس ہے،

۳- دستور الافاضل میں صدر کی وطنی نسبت ججنیر درج ہے اور یہی نسبت خود

کتبہ میں موجود ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دستور الافاضل کے بارے میں کچھ تفصیل درج کر دی جائے۔

فارسی کی اس فرہنگ کی ترتیب الفبائی ہے، ہر حرف ایک باب قرار دیا گیا ہے، اس میں عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں، اور اس لحاظ سے اس کو فارسی کے دوسرے قدیم فرہنگوں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اس لیے ث، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ ع، ق کے ابواب بھی موجود ہیں، لیکن یہ ابواب بہت مختصر ہیں، اگرچہ کہیں کہیں اعراب کا التزام ہے، لیکن پورے اصول کی پابندی نہیں، شواہد شعری بالکل نہیں، اس وجہ سے مولف کا دعوی کہ یہ لغت فرہنگ قواس سے ضخیم ہے، بے بنیاد ہے۔

دستور الافاضل کی بنیاد پر فارسی زبان میں تصحیف کے بعض مسائل روشن ہو جاتے ہیں، مثلاً انگدان کے معنی ببباس کے علاوہ نسناس ملتے ہیں، دستور میں اس کے معنی بباس درج ہیں، مگر موید الفضلاء میں اس کی تفصیل اس طرح آئی ہے[1]:-

انگدان بتازیش بباس خوانند و در فرہنگی است خلاف و نوعی از عطر

این ہر دو معنی اخیر از دستور الافاضل است جامع این لغات در دستور مذکور دید۔ دراں ورای

آں مسطور است و در ادات نیز ہمچنین است زیرا چہ گفتہ است کہ آنرا بباس خوانند

و ورای آں نسناس را گویند یعنی دیو مردم و آں جانوری باشد وحشی شبیہ بہ آدمی۔

دستور میں انگدان کی تشریح اس طرح پر ہے:-

"انگدان بباس یعنی جانبری کا دراق"

در اصل راق، ران کی تصحیف ہے، اور صحیح لفظ ران فرہنگ قواس میں موجود ہے،

---

[1] یہ بحث مقدمہ دستور الافاضل ص ۱۶ - ۱۷ پر درج ہے۔

صاحب مؤید الفضلا نے "دران" کو ورای آن پڑھا، اس سے قیاس کیا ہے کہ اس سے مراد نسناس ہے۔

دستور الافاضل میں الفاظ کی تشریح کے دوران ہندوستانی کلمات درج ہو گئے ہیں، ہندوستانی الفاظ کی ساڑھے چھ سو سالہ قدیم شکلیں علم صوت شناسی کے لیے بطور خام مواد استعمال ہو سکتی ہیں، راقم نے پروفیسر شیرانی مرحوم کی پیروی میں دستور کے علاوہ تین اور فرہنگوں سے ہندوستانی الفاظ منتخب کر کے الگ مضامین کی شکل میں شائع کر دیے ہیں، قواس اور دستور الافاضل پر مشتمل مضمون "نذر مالک رام" میں اور زفان گویا اور ادات الفضلا پر دو مضمون رسالہ اردو کراچی میں شائع کیے ہیں، (واضح ہو کہ دستور الافاضل کی طرح فرہنگ قواس اور زفان گویا کے ایک ہی مخطوطے ہیں، فرہنگ قواس راقم کی اعتنا سے بنگاہ ترجمہ و نشر کتاب تہران سے شائع ہو گئی ہے، اور زفان گویا بھی زیر ترتیب ہے)

دستور الافاضل اپنی اہمیت کی وجہ سے جہانگیری عہد تک کی اکثر فرہنگوں کے ماخذ میں شامل رہی ہے، یہاں تک کہ محمد بن قوام بن رستم نے ۹۵۰ھ میں شرح مخزن اسرار لکھی اور اس میں اس سے کافی استفادہ کیا، بعد میں اس کی اپنی فرہنگ بحر الفضائل کے منابع میں یہ کتاب موجود ہے۔ اسی طرح بدر دہلوی نے ادات الفضلا (تالیف ۸۲۲ھ) بدر ابراہیم نے زفان گویا (تالیف قبل ۸۳۷ھ) قوام الدین فاروقی نے شرف نامہ منیری (تالیف قبل اور مولف تحفۃ السعادہ (تالیف ۹۰۴ھ) فیضی سرہندی مولف مدار الافاضل (تالیف ۱۰۰۱ھ) اور شیخ لاد دہلوی مولف مؤید الفضلا (تالیف ۹۳۵) وغیرہ نے دستور الافاضل سے استفادہ کیا ہے، آخری کتاب جس میں دستور الافاضل کا ذکر ملتا ہے، وہ فرہنگ جہانگیری ہے۔

اس کا مولف جمال الدین حسین انجوی شیرازی ہے، جس نے ۱۰۱۱ ہجری میں یہ فرہنگ جہانگیر کے نام معنون کی تھی، اس کے بعد دستور کا ذکر نہیں ملتا، ایسا گمان ہوتا ہے کہ دستور کا نسخہ نایاب ہوگیا تھا۔

دستور الافاضل پر راقم نے ایک مفصل مضمون انگریزی میں مجلہ انڈو ایرانیکا میں شائع کیا تھا، جس میں اس فرہنگ کے خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی تھی، بعد میں جب یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی تو اس کے مقدمے میں راقم الحروف نے مولف کتاب اور اس کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی، اس بنا پر اب ان امور کے دہرانے کی چنداں ضرورت باقی نہیں، لیکن چونکہ ان دونوں جگہوں پر اس کتاب کی دکنی نسبت کا ذکر نہیں ہے، اس لیے اس کا کسی قدر تفصیلی ذکر ضروری قرار پایا،

خلاصۂ کلام یہ کہ دستور الافاضل کا شمار دکن کے فارسی ادب کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت ضروری ہے کہ اس کی تالیف اسی خطے میں اس وقت ہوئی جب بہمنی حکومت کی داغ بیل نہیں پڑی تھی، اور چونکہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے کافی اہم اور اسی کے نتیجے میں کافی مقبول و متداول رہی ہے، اس لیے تاریخ میں اس کو اہم مقام حاصل ہونا چاہیے۔

اس گفتگو کے نتیجے کے طور پر چند امور قابل توجہ ہیں:-

۱- دستور الافاضل عہد بہمنی سے قبل کی تالیف ہے، اس سے قبل عہد بہمنی کے قلیل فارسی ادب میں قابل توجہ اضافہ ہوا۔

۲- فارسی فرہنگوں میں دستور، اپنی قدامت کی وجہ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس اعتبار سے شاید ہی کوئی ہم عصر تصنیف اس کے ہم پلہ ہو۔

۳- اس کتاب سے معلوم ہوا کہ خطۂ دکن کا صدر مقام استاد آباد تھا، یہ نام اب باقی نہیں، البتہ ایک کتبے سے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے، تصنیف ہذا اس کا دوسرا اہم ماخذ ہے۔

۴- محمد بن تغلق (۷۲۵ - ۷۵۲) کے دور کے ایک صدر شمس الدین محمد کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے، اس صوبہ دار کا حال کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ہوسکتا، اس لحاظ سے یہ کتاب ایک اہم ماخذ کا کام دیتی ہے۔

۵- دستور الافاضل کے مقدمے سے خاندان تغلق کے دکن میں سیاسی اقتدار و نفوذ کا پتہ چلتا ہے، اس اعتبار سے اس کا مطالعہ دلچسپ اور اہم ہے۔

۶- اس کتاب سے اس بات کی مزید توثیق و تصدیق ہوئی کہ اس دور میں علماء و فضلاء کی آمد و رفت شمالی ہند سے برابر رہتی تھی، حاجب خیرات کی طرح بسا اوقات لوگ تلاش معاش میں دکن جاتے تھے، تصوف و عرفان کی تبلیغ کیلئے بھی اس سرزمین میں کافی کشش تھی، شیخ راجو قتال، سید گیسو دراز وغیرہ اسی مقصد کے تحت دکن تشریف لائے۔

ضمناً یہ بات قابل ذکر ہے کہ بہمنی حکومت کی تاسیس سے قبل علماء و فضلاء اکثر شمالی ہند سے آتے تھے، لیکن بہمنی حکومت کے قیام کے بعد اہل دکن کا علمی و ثقافتی تعلق عرب، ایران اور دوسرے ممالک اسلامیہ سے براہ راست قائم ہوگیا، اس کے نتیجے میں ہزاروں ایسے افراد ان ممالک سے دکن آئے جو کسی نہ کسی شعبۂ زندگی میں امتیاز رکھتے تھے، قرون وسطیٰ میں دکن کی علمی و ادبی سرگرمی کے علاوہ سیاسی تاریخ میں بھی اس تعلق کو خصوصی اہمیت حاصل ہے، غیر ملکیوں کے اس سیلاب کی وجہ سے بہمنی دور ہی میں ملکی و غیر ملکی سوال اتنا زور پکڑ گیا تھا کہ ان میں برابر

آویزش ہوتی رہتی تھی، یہاں تک کہ سلطان علاء الدین احمد کے دورِ حکومت (۸۳۸-۸۶۲) میں چاکنہ میں ملکیوں اور خارجیوں میں بڑی زبردست جنگ ہوئی، اس کے نتیجے میں دو ہزار سے زیادہ غیر ملکی مقتول ہوئے، جن میں صاحب برہان مآثر کی روایت کے بموجب بارہ سو (۱۲۰۰) صحیح النسب سادات تھے،

اس مختصر گذارش کا اصل مقصد اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ دکن کا فارسی ادب ابھی بہت کچھ محتاج تحقیق و تنقیح ہے۔

سلسلۂ شعر العجم

مرتبہ مولانا شبلی

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ ہر عہد کے تمام مشہور شعراء کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے، یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے:-

شعر العجم حصہ اول :- عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ۔ قیمت ۱۰ روپے ۹۵ پیسے

" " دوم :- شعرائے متوسطین یعنی خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ شیرازی اور ابن یمین کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت: ۸ روپے ۷۵ پیسے

" " سوم :- شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ اور کلام کی خصوصیت : قیمت: ۶ روپے ۲۵ پیسے

" " چہارم :- شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ قیمت: ۹ روپے ۴۵ پیسے

" " پنجم :- قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری کا پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت: ۸ روپے ۵۰ پیسے

منیجر

یہود اور قرآن مجید

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

اخلاق و عادات | خدا اور آخرت پر عدم یقین، نسلی فخر و برتری کے احساس اور نبوت و رسالت کو اپنی خاندانی اجارہ داری سمجھنے کی بنا پر یہود میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، اور وہ ذہنی و اخلاقی اعتبار سے نہایت گھٹیا اور پست ہو گئے تھے، گذشتہ مباحث میں انکی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس سے بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ وہ اخلاقی خوبیوں اور محاسن صفات سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے تھے، اب ان کے معائب اور اخلاقی پستیوں کی مزید کچھ مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔

کفرانِ نعمت | محسن کی ناشکری اور نعمت کی ناقدری دین و شریعت کی نگاہ ہی میں جرم نہیں ہے بلکہ دنیا کے عام اصول و دستور کے رو سے بھی اس کو بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے، جانوروں تک میں شکر گذاری اور اظہار ممنونیت کا جذبہ موجود ہوتا ہے، گھوڑے اور کتے بھی اپنے مالکوں کی وفاداری کا دم بھرتے نظر آتے ہیں، انسان پر خدا نے گوناگوں احسانات کیے ہیں، وہ اپنی پیدایش سے وفات تک خدا کی نعمتوں میں گھرا رہتا ہے، اسی لیے فرمایا:-

وَاٰتٰکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۔ اور تم کو ہر اس چیز میں سے دیا جس کو تم نے

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۔ مانگا اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے

إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ (ابراہیم: ۳۴)

تو ان کو شمار نہ کر پاؤ گے، بے شک انسان بڑا حق تلف ناشکرا ہے۔

یہ زمین و آسمان، چاند، سورج، ستارے، شجر و حجر، سمندر، دریا، پہاڑ، چوپائے، مویشیاں، پرندے اور مچھلیاں، غرض کائنات کی ہر ہر چیز خدا کی نعمت اور انسان کے تمتع کے لئے بنائی گئی ہے،

أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (لقمان: ۲۰)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اللہ نے اُن سب کو تمہارے نفع کے لیے کر دیا اور تم پر اپنی کھلی اور پوشیدہ (سب طرح کی) نعمتیں پوری کر دیں۔

یہود کو خدا نے اپنی ان عام اور ان گنت نعمتوں کے علاوہ متعدد مخصوص نعمتیں اور فضیلتیں بھی بخشی تھیں، جن کو اس مضمون کے شروع میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، توراۃ ان نعمتوں اور خداوندی احسانات کی یاد دہانیوں سے بھری ہوئی ہے، قرآن مجید میں ہے:۔

سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ وَمَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (بقرہ: ۲۱۱)

بنی اسرائیل سے پوچھو ہم نے ان کو کتنی کھلی نشانیاں دیں اور جو اللہ کی نعمت پانے کے بعد اس کو بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔

نعمت سے کتاب و شریعت اور ہدایت الٰہی مراد ہے اور اس میں تبدیلی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے اس کو ٹھکرایا، اس کی ناقدری کی اور اس سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے اس کو کفر و شرک کا ذریعہ بنایا، نیز انھوں نے خدا کی تعلیم و ہدایت کی اصل حقیقت گم کر کے

اس کو کچھ سے کچھ بنا دیا، اس میں تحریف کر کے اس کے معنی و مطلب کو خبط کر دیا، اس پر بھی مفصل گفتگو ہو چکی ہے، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے یہود سے سب سے بڑھکر توقع تھی کہ وہ خدا کے شکر گذار ہوں گے اور لوگوں کے احسانات کا بدلہ بھی احسان سے دیں گے مگر انھوں نے سب سے زیادہ ناشکری کا رویہ اختیار کیا، اس لیے قرآن نے جا بجا ان کو تنبیہ و ملامت کے انداز میں مخاطب کیا، صرف سورہ بقرہ میں تین جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ (بقرہ: ۴۰-۴۷-۱۲۲)

اے بنی اسرائیل! میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے خدا کی بڑی ناشکری اور اس کی نعمتوں اور احسانات کی سخت ناقدری کی تھی، چنانچہ ان کو یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ دیکھو خدا نے تم کو اپنے خاص فضل و کرم سے جو نعمتیں عطا کی تھیں تم نے ان کو بالکل ہی بھلا دیا، حضرت موسیٰؑ نے بھی بار بار ان کو خدا کے احسانات یاد دلائے ہیں اور کفران نعمت پر زجر و توبیخ کی ہے، اس کا بھی پہلے ذکر ہو چکا ہے، خود خداوند قدوس نے بھی ان کو ناشکری کے نتائج سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا، فرمایا:۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ (ابراہیم: ۷)

اور یاد کرو جب تمہارے خداوند نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم نے شکر ادا کیا تو میں تمہیں بڑھاؤں گا اور اگر تم نے ناشکری کی تو میرا عذاب بھی بڑا سخت ہوگا۔

مگر اس آگاہی اور تنبیہ کے بعد بھی وہ کفران نعمت سے باز نہ آئے، اور جب ان کا خدا

اپنے سب سے بڑے محسن کے ساتھ یہ معاملہ تھا جس نے قدم قدم پر ان کی دستگیری کی تھی، اور ان پر انعامات کی بارش کی تھی تو وہ بندگانِ الٰہی کے احسانات کے کب شکر گذار ہو سکتے تھے،

نقض عہد قرآن مجید نے یہود کے اس اخلاقی جرم کا بار بار ذکر کیا ہے، اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد شکنی اور غداری ان کی مستقل روش اور عادتِ ثانیہ بن گئی تھی، انکی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہے، قرآن مجید میں ہے:

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (بقرہ: ۱۰۰)

تو کیا یہ جب جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔

دوسری جگہ ان کے نقض عہد کا ان لفظوں میں ذکر ہے:-

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (بقرہ: ۸۳)

پھر تم برگشتہ ہو گئے، مگر بہت تھوڑے لوگ اور تم منہ موڑنے والے ہی لوگ ہو۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود سے جن باتوں کی پابندی کا عہد لیا گیا تھا، ان کو انھوں نے توڑ دینے کی حرکت اتفاقاً نہیں کی تھی بلکہ یہ اُن کی عادت مستمرہ اور مستقل صفت تھی، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے، تو ان سے غیر جانبدار رہنے کا معاہدہ کیا، آپؐ خود تو اس معاہدہ کا برابر احترام کرتے رہے لیکن یہود ایک دن بھی صدقِ دل سے اس کو نہ نباہ سکے، پہلے تو در پردہ وہ کفار مکہ کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اور آخر میں کھل کر ان کے جانبدار اور مسلمانوں کے دشمن ہو گئے، یہی عہد شکنی اور غداری آج بھی یہود کا قومی مزاج بنی ہوئی ہے، حالانکہ ان کے صحیفوں میں ایفائے عہد کی خاص طور پر تلقین کی گئی تھی، توراۃ کے احکام عشرہ کی ایک دفعہ یہ بھی تھی، اسی لیے قرآن نے جہاں یتیم کے مال میں خیانت سے

روکا ہے، وہیں عہد میں خیانت کرنے سے بھی منع کیا ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل: ۳۴)

اور عہد کو پورا کیا کرو، کیونکہ عہد کی باز پرس ہوگی۔

سب سے مقدم اور اہم عہد وہ ہے جو روز ازل میں توحید اور اطاعتِ الٰہی کا خدا نے اپنے بندوں سے لیا تھا، بنی اسرائیل کو جب اس نے اپنی کتاب و شریعت سے نوازا تو اس فطری عہد کی از سر نو تجدید کی، فرمایا:-

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ: ۴۰)

اور میرے عہد کو پورا کرو، میں تمھارے عہد کو پورا کروں گا۔

توراۃ میں بھی اس کا ذکر ہے:

”تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرعوں اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔“ (استثناء ۲۶، ۱۷)

اسی ضمن میں وہ سب عہد بھی آتے ہیں جو توراۃ پر مضبوطی سے قائم رہنے، خدا کے احکام و ہدایات کو بے چون و چرا ماننے، کتب الٰہی اور پیغمبروں خصوصاً نبی آخر الزماںؐ اور قرآن مجید پر ایمان لانے کے بارہ میں یہود سے لیے گئے تھے،

دوسرا عہد وہ ہے جو باہم قول و قرار سے ہوتا ہے، اس کی پابندی بھی لازمی ہے، کیونکہ اجتماعی و تمدنی زندگی کا اسی پر دارومدار ہوتا ہے، اگر باہمی معاہدوں کا احترام نہ کیا جائے تو اجتماعی و تمدنی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تیسرا وہ عہد ہے جو اہل حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کی ادائیگی کا عرفاً و دستوراً

ہر انسان مکلف ہوتا ہے اور خدا نے بھی ان کی ادائیگی کا حکم دیا ہے،

یہ سارے عہد ان سے بڑے اہتمام سے لیے گئے تھے، حضرت موسیٰؑ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ سارے بنی اسرائیل یا ان کے سرداروں کو عبادت گاہ میں جمع کرتے، تابوت سامنے ہوتا اور وعظ و تذکیر کے بعد خدا اور لوگوں کو گواہ ٹھہرا کر ہدایت الٰہی کی تعلیم و تلقین کرتے اور نافرمانی اور عہد شکنی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے، یہود کے ۱۲ بارہ قبیلے تھے، حضرت موسیٰؑ نے ہر ہر قبیلہ کا ایک ایک نقیب (سردار) مقرر کر دیا تھا، تاکہ وہ ان کی نگرانی کر کے ان کو اللہ کے عہد پر استوار رکھیں اور اس سے منحرف نہ ہونے دیں[۲]۔

یہود کی مکمل شریعت ان کے اور خدا کے درمیان ایک عہد و میثاق تھی، اسی لیے توراۃ کا نام بھی عہد نامہ پڑ گیا ہے، کیونکہ اس میں خدا کی اطاعت و بندگی کے اقرار، اس کے احکام و قوانین کی پیروی، اس کی کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے نیز بندوں سے کیے گئے قول و قرار پر استوار رہنے اور قرابتداروں اور دوسرے اہل حقوق کے حقوق کی ادائیگی کا عہد لیا گیا ہے۔

مگر یہود سے جو عہد اس درجہ اہتمام سے لیے گئے تھے اور جن پر قائم رہنے پر ان سے دنیا و آخرت کی ہر خیر و برکت کا خدا نے وعدہ فرمایا تھا، اس کی انھوں نے دھجیاں اڑا کر رکھ دیں، قرآن نے ان کی اس عہد شکنی پر ان کو اس بیوقوف عورت جیسا بتایا ہے جو اپنا سوت کاتنے کے بعد خود ہی اس کو تار تار کر دیتی ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا	اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرو
عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ	جبکہ تم نے اسے باندھا ہے اور قسموں کو
بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ	مؤکد کرنے کے بعد نہ توڑو، درانحالیکہ تم
اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ	اللہ کو اپنے اوپر ضامن اور گواہ بنا چکے ہو،

[۱] مائدہ ۱۲:

مَا تَفْعَلُوْنَ ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَا	بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو اور
لَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ	اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنے
قُوَّةٍ اَنْكَاثًا (نحل: ۹۱-۹۲)	سوت کو خوب مضبوط کاتنے کے بعد تار تار کر کے [illegible]

یہود عہد شکنی سے آگے بڑھکر عہد فروشی بھی کرنے لگے تھے، دنیا کے معمولی فائدے اور حقیر مفاد کی خاطر ان کو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو فروخت کرنے میں ذرا بھی باک نہ ہوتا، ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ	جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک
اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا	حقیر قیمت کے بدلے بیچتے ہیں ان کے لیے
اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ	آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ نہ ان سے
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ	بات کریگا، نہ انکی طرف قیامت کے دن
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ	دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کریگا، ان کیلیے
وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (آل عمران)	دردناک عذاب ہے۔

یہ تو عہد شکنی و عہد فروشی کے اخروی انجام کا ذکر تھا، اس کے نتیجہ میں دنیوی ذلت و خواری بھی ان کے حصہ میں آئی، فرمایا:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ	سو ان کے اپنے عہد کو توڑ دینے کے سبب
لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ	ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے
قٰسِيَةً (مائدہ: ۱۳)	دلوں کو سخت کیا۔

کبر و غرور وہ غرور اور گھمنڈ کے نشہ میں بھی متوالے تھے، حالانکہ ان کو جو احکام دیے گئے تھے ان میں اس کی تاکید کی گئی تھی کہ "زمین پر اکڑ کر نہ چلیں اور تواضع و خاکساری اختیار کریں[۲]"۔

[۱] عام مفسرین کے نزدیک ان آیتوں میں خطاب مشرکین سے ہے لیکن قرینہ اور فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخاطب یہود ہیں۔
[۲] بنی اسرائیل ۳۷

اسی بنا پر جب وہ قریہ اریحا میں فاتحانہ داخل ہو رہے تھے تو اللہ نے ان کو خاص طور پر حکم دیا کہ عاجزانہ اور سرفگندہ ہو کر جاؤ، مجسم خاکساری اور انکسار بن کر خدا کا شکر بجا لاتے اور استغفار کرتے ہوئے پھاٹک میں داخل ہو اور تمہاری کسی ادا سے رعونت اور تمکنت کا اظہار نہ ہو، مگر اسکے باوجود وہ اکڑتے، اتراتے، شیخیاں کرتے اور فخر و غرور کے نشہ میں سرشار ہو کر داخل ہوئے[۵]"

یہود کی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کا سبب ان کا یہی پندار تھا کہ وہ ایک معزز اور برگزیدہ خاندان کے لوگ، انبیاء کی اولاد اور خدا کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، اس لیے ان کیلئے ہر چیز روا ہے، انھوں نے اسی گھمنڈ میں آکر اپنے کو ایمان کے تقاضوں اور اطاعت و عمل کی ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش کر لیا تھا، اور اپنے علاوہ ساری دنیا کو حقیر و ذلیل سمجھتے تھے، قرآن نے ان کے اس پندار کا کئی جگہ ذکر کر کے اس پر ضرب لگائی ہے، فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ أَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَأَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۱۸)

اور یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

توراۃ میں بھی ان کی اس ڈینگ اور شیخی کا ذکر موجود ہے۔

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء ۱۴: ۱)

"تو خداوند اپنے خدا کے لیے مقدس قوم ہے، اور خداوند نے تجھکو چن لیا تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لیے خاص قوم ہو" (استثناء ۱۴: ۲)

"خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ پلوٹھا ہے" (خروج ۴: ۲۲)

ان کے پاس ایمان و یقین اور اطاعت و عمل کا تو کوئی سرمایہ نہ تھا لیکن دوسروں کو فریب دینے کے لیے اپنی پاکی داماں کی حکایت زور شور سے بیان کرتے اور اپنی خاندانی برتری اور تقدس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے، ارشاد ہے

[۵] بقرہ: ۵۸ و ۵۹ و اعراف: ۱۶۱ و ۱۶۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىْ مَنْ يَّشَآءُ (نساء - ۴۹)

ذرا ان کو تو دیکھو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ قرار دیتے ہیں بلکہ اللہ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔

اسی استکبار نے ان کو سب سے بے نیاز یہاں تک کہ خود خدا سے بھی مستغنی کر کے اس کی نافرمانی اور طغیان پر آمادہ کر دیا تھا، وہ اپنی عظمت و برتری اور خاندانی و دینی فضیلت کو خدا کا فضل و انعام سمجھنے کے بجائے اپنی محنت و کوشش کا ثمرہ سمجھتے تھے، اور اس پر اس قدر نازاں تھے کہ کسی اور دین و شریعت کو تسلیم کرنے کے لیے مطلق تیار نہ تھے، ان کے نزدیک دین بس ان کا دین، کتاب صرف انکی کتاب اور شریعت محض ان کی شریعت تھی، اسی لیے وہی ہدایت یافتہ اور تمام لوگ گمراہ تھے، فرمایا:

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (بقرہ: ۱۳۵)

اور انھوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔

یہی تکبر قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں بھی سب سے بڑی رکاوٹ تھا کہ جب وہ خود حامل شریعت اور مقدس لوگ ہیں تو دینی و مذہبی پیشوائی کا حق ان کے سوا اور کسی کو کیسے مل سکتا ہے۔ اور ان کو کسی نئی کتاب اور نئے نبی پر ایمان لانے کی کیا ضرورت؟ نبوت و رسالت ان کی اجارہ داری ہے، ان کے خاندان کے باہر نہ کوئی نبی ہو سکتا ہے اور نہ ان کو نظر انداز کر کے خدا کسی اور گروہ میں رسول مبعوث کر سکتا ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ (بقرہ ۸۷)

تو کیا جب جب کوئی رسول آئیگا تمہارے پاس وہ باتیں لیکر جو تمہاری خواہشوں کے خلاف ہوں گی تو تم تکبر کرو گے؟ سو تم نے ایک گروہ کو جھٹلایا اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔

اسی زعم باطل میں مبتلا ہو کر وہ آخرت کی فکر اور جزا و سزا سے بالکل غافل اور بے پروا ہو گئے تھے، حد یہ ہے کہ ان کے مقدس صحیفے اور نوشتے بھی حشر و نشر اور جزا و سزا کے ذکر سے تقریباً خالی ہیں، چنانچہ انھوں نے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر لیا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں ان کے عقائد و اعمال جیسے کچھ بھی ہوں ان سے کوئی مواخذہ اور باز پرس نہ ہوگی، نجات اخروی ان کا مخصوص حق ہے، جنت کا خدا نے ان کو لائسنس دے رکھا ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ	اور کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں داخل ہو سکتے
إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ	مگر وہی جو یہودی ہیں یا نصرانی۔

نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد اعمال کے بجائے گروہی نسبتوں پر تھا، ان کا خیال تھا کہ ان کو دوزخ کا عذاب سرے سے لاحق ہی نہیں ہو سکتا اور اگر لاحق بھی ہوا تو گئوسالہ پرستی کے جرم میں محض چند روز کے لیے۔ یہی جھوٹے سہارے اور موہوم آرزوئیں اور تمنائیں ان کے لیے دین بن گئی تھیں،

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا	یہ اس وجہ سے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ
النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ	کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی، یہ جو
وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا	کچھ گڑھتے ہیں اس نے ان کو ان کے دین
يَفْتَرُونَ (آل عمران: ۲۴)	کے بارہ میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔

اسی فریب اور خام خیالی کی وجہ سے وہ بھی نصاریٰ کی طرح شفاعت اور کفارہ کا باطل عقیدہ رکھنے لگے تھے، ان کے مذہبی صحیفہ تالمود میں ہے:۔

"قیامت کے دن ابراہیم دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے .... جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی۔"

اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمال حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے۔"

حسد

یہود کو سب سے زیادہ حسد مسلمانوں سے تھا، وہ ان کے خلاف حسد کی آگ میں اس لیے جل بھن رہے تھے کہ اللہ نے انکو ایمان و قرآن کی دولت عطا کی تھی اور عربوں میں اپنے دین اور آخری نبی کو مبعوث کیا تھا، ان کا سارا غصہ اس پر تھا کہ انبیاء تو ہمیشہ بنی اسرائیل میں ہوتے رہے ہیں اور کتاب و شریعت سے ہمیشہ وہی نوازے جاتے رہے ہیں، اب یہ نعمت ان سے چھین کر عربوں اور اسماعیلیوں کو کیوں دی جا رہی ہے، وہ جانتے تھے کہ نبوت کے ان کے خاندان سے نکل جانے کے بعد ان کی دینی پیشوائی اور دنیوی اقتدار باقی نہیں رہے گا، اس لیے وہ آگ بگولہ ہو کر مسلمانوں سے حسد کرنے لگے، قرآن نے ان کو بتایا کہ نبوت کسی کا موروثی حق نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا فضل ہے اور وہ اپنا فضل جس کو بھی چاہے عطا کرے، تم اس میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِنَ الْمُلْكِ	کیا خدا کے اقتدار میں کچھ ان کا بھی دخل ہے
فَإِذًا لَا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا	کہ یہ لوگوں کو کچھ بھی دینے کو تیار نہیں؟
أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ	کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس فضل
مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ	پر جو اللہ نے ان کو دیا ہے، سو ہم نے تو
فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ	آل ابراہیم[1] کو کتاب و حکمت بھی دی ہے،
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ	اور ہم نے ان کو ایک عظیم سلطنت بھی
مُلْكًا عَظِيمًا (نساء: ۵۳-۵۴)	عطا کی ہے۔

[1] عموماً مفسرین نے آل ابراہیم سے یہاں بنو اسرائیل مراد لیا ہے مگر بنو اسماعیل کو مراد لینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

اور جب ان کے علی الرغم خدا نے اپنی ہدایت و شریعت اور امامت و سیادت بنی اسماعیل میں منتقل کر دی تو وہ جوش حسد میں اس تگ و دو میں لگ گئے کہ مسلمانوں سے یہ نعمت چھین لیجائے ان کی ان کوششوں کو جو وہ مسلمانوں کو اس رحمت خداوندی سے محروم کرنے کے لیے کر رہے تھے بعض سادہ لوح اور نیک دل مسلمان اخلاص اور ہوا خواہی پر محمول کرتے تھے، اس لیے فرمایا کہ یہ ساری سرگرمیاں کسی خلوص اور خیر خواہی پر مبنی نہیں ہیں بلکہ ان کے جذبۂ حسد کا کرشمہ ہیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ
لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ	تمھارے ایمان کے بعد پھر تم کو کفر کی حالت
كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ	میں لوٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے،
أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ	حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے
لَهُمُ الْحَقُّ (بقرہ: ۱۰۹)	باوجود۔

ان کو بھلا تم پر خیر و برکت کا نازل کیا جانا کب گوارا ہو سکتا ہے۔ (بقرہ: ۱۰۵)

اسی حسد نے ان کو قرآن اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی شدید مخالف بنا دیا تھا حالانکہ قرآن مجید ان کی کتابوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق نازل ہوا تھا،

یہود صرف مسلمانوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے حاسد نہ تھے بلکہ ان کا حسد خود اپنے پیغمبروں سے بھی رہا ہے، عہد عتیق کی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ کے برادر و خداوند کے مقدس مرد ہارون پر حسد کیا"۔ (زبور ۱۰۶-۱۶)

اور عہد جدید میں بھی ان کے رشک و حسد کا ذکر ہے:۔

"یہودیوں نے حسد میں آکر بازاری آدمیوں میں سے کئی بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لیا اور بھیڑ لگا کر شہر میں فساد کرنے لگے"۔ (اعمال۔ ۱۷ : ۵)

"یہودی اتنی بھیڑ دیکھکر حسد میں بھر گئے"۔ (اعمال۔ ۱۳ : ۴۵)

تعصب یہود کے کبر و غرور اور رشک و حسد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے انکی ضد، ہٹ دھرمی اور ان کا نسلی و قومی تعصب اور گروہی عصبیت بھی ظاہر ہوتی ہے، وہ قرآن کی مخالفت نہ تو کسی غلط فہمی کی بناء پر کر رہے تھے اور نہ اس میں ان کے خلوص اور حق پسندی کا کوئی دخل تھا، ان کو اس کے حق و ناحق ہونے سے کوئی بحث نہ تھی بلکہ بحث صرف یہ تھی وہ ان کے خاندان اور گروہ کے اندر کیوں نہیں نازل کیا گیا، اسی لیے جب ان کو قرآن پر جسے خدا ہی نے اتارا تھا، ایمان لانے کی دعوت دیجاتی تو وہ کہتے کہ ہم تو اسی چیز کو مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہے، ظاہر ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی ہدایت کی محض اس تعصب کی وجہ سے مخالفت کرنا کہ وہ ہمارے خاندان اور گروہ کے بجائے دوسرے خاندان میں کیوں اتاری گئی کھلی ہوئی دھاندلی اور صریح زیادتی ہے، فرمایا:۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ	کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انھوں نے
أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ	اپنی جانوں کو بیچ ڈالا کہ وہ انکار کر رہے ہیں
بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ	اس چیز کا جو اللہ نے اتارا ہے محض اس ضد
عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ	کی بنا پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے
(بقرہ: ۹۰)	جس پر چاہا اپنا فضل اتارا۔

ان کے لیڈر اسی قومی تعصب اور گروہی و نسلی عصبیت کی آگ اپنی قوم کے اندر بھڑکا رہے تھے، کہ اپنے دائرہ کے باہر کسی کی بات ماننا اور کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کے دعویٰ کی تصدیق کرنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، ورنہ جو دینی سیادت و پیشوائی ہم کو حاصل ہے وہ انکو حاصل ہو جائے گی اور اگر ہم نے غیر اسرائیلی نبی کے حق میں کوئی بات اپنی زبان سے نکالی تو مسلمان

قیامت کے دن اس کو ہمارے خلاف حجت بنائیں گے، قرآن نے ان کے اس اندھے تعصب پر اس طرح تنبیہ کی کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہے جس کی تم کو پیروی کرنی ہے، خواہ وہ کسی اسرائیلی نبی کے ذریعہ سے آئی ہو یا اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے، نجات و فلاح کی راہ خدا کی ہدایت پر موقوف ہے، نہ کہ یہودیت و نصرانیت پر؟ پھر کیوں ایسی تنگ نظری اور گروہی عصبیت کی باتیں کرتے ہو؟ فرمایا:-

وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ
قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَنْ
يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ
أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ
إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ
مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ
(آل عمران: ۷۳)

اور تم لوگ اپنے دین کو ماننے والوں کے علاوہ کسی کی بات کو نہ مانو! کہو کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے، ورنہ اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تم کو ملی ہے یا وہ تم سے تمہارے رب کے حضور حجت کرسکیں، کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ ہی بڑی وسعت والا اور علم والا ہے۔

بغض و عداوت

حسد اور تعصب کا لازمی نتیجہ بغض و عداوت ہے، یہ آگ بھی یہود کے دل میں نہایت شدت سے بھڑک رہی تھی، ان کو سب سے کد تھی یہاں تک کہ باہم بھی جیسا کہ آگے آئیگا ایک دوسرے سے سخت نفرت رکھتے تھے، لیکن ان کے غیظ و غضب اور بغض و کینہ کا خاص نشانہ مسلمان تھے، وہ اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی میں مشرکین کے ہم پلہ بلکہ ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے، فرمایا:-

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ
عَدَاوَةً لِلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ
وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا (مائدہ-۸۲)

تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے

مشرکین کی اسلام دشمنی کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن یہ حامل کتاب و شریعت ہو کر بھی مسلمانوں کی عداوت میں اس قدر سرگرم تھے کہ ان کے خلاف مشرکین سے پینگیں بڑھانے میں ان کو شرم نہ آتی، ارشاد ہے۔

تَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ
الَّذِينَ كَفَرُوا (مائدہ-۸۰)

تم ان میں سے بہتوں کو دیکھو گے کہ کفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔

وہ اس دشمنی میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی حمایت کرتے تھے، اور بے تکلف ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ سمجھتے تھے،

وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا (نساء-۵۱)

اور وہ کافروں کے بارہ میں کہتے ہیں کہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر تو یہی لوگ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی میں غیر جانبداری کے معاہدہ کے باوجود انھوں نے کفار قریش سے ساز باز شروع کر دی تھی، قرآن نے ان کے اس انتقام اور دشمنی کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ لوگ خود شرک و بت پرستی میں ملوث ہو کر راہ ہدایت ترک کر چکے ہیں، اس لیے ایمان کے بجائے ان کو کفر و فسق زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ هَلْ تَنْقِمُونَ
مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ
إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ وَأَنَّ
أَكْثَرَكُمْ فَاسِقُونَ
(مائدہ - ۵۹)

اے اہل کتاب تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہماری طرف بھیجی گئی اور اس چیز پر جو پہلے اتاری گئی، اور تم میں اکثر نافرمان ہیں۔

ان کو مسلمانوں کی کامیابی اور ان کے آرام سے رنج ہوتا ہے اور انکی شکست اور نقصان

ے خوشی ہوتی ہے، اس لیے وہ ان کے اندر فساد اور بگاڑ پیدا کرنے کے لیے پیش پیش رہتے ہیں ٹھیک یہی کیفیت آج بھی ان کی ہے، وہ سب کو انگیز کر سکتے ہیں، سب سے مصالحت کر سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے خلاف سازش اور ریشہ دوانی سے باز نہیں آسکتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بھی ان سے ترک موالات کی تلقین کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! اپنوں کے سوا کسی کو
بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ	راز دار نہ بناؤ، یہ لوگ تمھارے اندر فساد
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ	پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے
الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي	یہ تمھارے دکھ پہنچنے کے آرزو مند رہتے ہیں
صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ	انکی عداوت انکے مونھوں سے ظاہر ہو پڑتی
(آل عمران - ۱۱۸)	ہے اور جو کچھ یہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے

اختلاف اور فرقہ بندی

قرآن مجید نے اہل کتاب خصوصاً یہود کے اختلاف و افتراق میں پڑ جانے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے، ایک جگہ فرمایا:-

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	اور نہیں متفرق ہوئے اہل کتاب مگر اسکے بعد
إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ (بینہ)	کہ ان کے پاس واضح دلیل آگئی۔

دوسری جگہ ہے:-

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ	بیشک اللہ کا اصل دین اسلام ہے، اہل کتاب
وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ	نے تو اس میں اختلاف علم کے آجانے کے بعد
إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ	محض باہمی ضد اور سرکشی کے سبب سے
بَغْيًا بَيْنَهُمْ (آل عمران - ۱۹)	کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے خدا کے دین و شریعت کے بارہ میں اختلاف کیا اور اسکے نتیجہ میں ان کے اندر تحزب اور گروہ بندی پیدا ہو گئی، ان کے مختلف خاندان اور قبیلے بھی باہم گتھم گتھا رہتے تھے، ان کے اختلافات کو رفع کرنے کے لیے اللہ نے اپنی کتابیں اتاریں مگر حق کو جان لینے اور واضح دلائل آجانے کے باوجود ان کے اختلافات اور گروہ بندی ختم نہ ہوئی بلکہ حرب و ضرب اور قتل و خون ریزی تک نوبت پہنچ گئی، اور دوسروں میں فساد و اختلاف پیدا کرنا ان کا قومی مزاج بن گیا ہے، جس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اپنے بھائیوں کا قتل اور انکی جلاوطنی

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ انبیاء وصلحا کے خون ناحق سے یہود کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، اب یہ دکھانا مقصود ہے کہ وہ اپنے بھائی بندوں کو بھی قتل کرتے اور جلاوطن کرتے تھے، حالانکہ اس جرم شنیع سے باز رہنے کا ان سے خدا نے عہد لیا تھا، فرمایا:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا	اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ
تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ	اپنوں کا خون نہ بہاؤ گے اور نہ اپنوں
أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ	کو اپنی بستیوں سے نکالو گے، پھر تم نے
وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ (بقرہ - ۸۴)	(ان باتوں کا) اقرار کیا اور تم اسکے گواہ ہو

سورۂ مائدہ میں قتل کی مذمت اور قصاص کے حکم کے توراۃ میں بیان کیے جانے کی صراحت کی گئی ہے[1]، موجودہ تورات میں بھی اس کا ذکر ہے:

"تو خون مت کر" (خروج - ۲۰ : ۱۳)

"بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو" (استثنا - ۱۹ : ۱۰)

اور قصاص کا ذکر اس طرح ہے:-

[1] آیات ۳۲ - ۴۵

"جو کوئی آدمی کا لہو بہائے آدمی ہی سے اس کا لہو بہایا جائے گا کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔" (پیدائش - ۹: ۶)

اور تالمود میں ہے :-

"جو کوئی کسی ایک اسرائیلی کو بھی مار ڈالے گا اس کے لیے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ساری نسل اسرائیل کو قتل کر دیا۔"

اسی طرح اعضا و جوارح کے قصاص کا بھی ذکر ابواب خروج، احبار اور استثنا میں ملتا ہے اور اس عہد کے اقرار و شہادت کا بھی توراۃ میں ذکر ہے:

"وہ بولے کہ سب کچھ جو خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج ۲۴: ۷)

لیکن انھوں نے اس عہد و میثاق کی دھجیاں نہایت بے دردی سے بکھیر دیں۔ ارشاد ہے

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَاۤءِ تَقْتُلُوْنَ	پھر تم ہی لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو
اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا	اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کی بستیوں
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ	سے نکال لیتے ہو اور ان کے خلاف حق تلفی
عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	اور زیادتی کر کے ان کے دشمنوں کی مدد
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ	کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی
وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ	ہو کر آتے ہیں تو ان کا فدیہ دیکر چھڑاتے ہو
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ	حالانکہ انکا نکالنا ہی تمہارے اوپر حرام تھا
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (بقرہ: ۸۵)	تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا انکار کرتے ہو۔

توراۃ کے باب سلاطین میں یہود کی مختلف شرارتوں کے ضمن میں اس کا بھی ذکر ہے، ملاحظہ ہو:

"پھر انھوں نے نہ سنا بلکہ اپنے باپ دادوں کی گردن کشی کی مانند جو خداوند اپنے خدا پر ایمان نہ لائے تھے گردن کشی کی۔" (سلاطین - ۱۷: ۱۴)

جب یہودیہ اور اسرائیل کی علٰحدہ علٰحدہ سلطنتیں قائم ہوئیں تو ان میں سخت کشمکش تھی اور یہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتیں اور ان میں برابر قتل و خون ریزی ہوتی رہتی، عہد نبوی میں بھی ان کے جو قبیلے مدینہ میں آباد تھے، ان میں بھی باہم خانہ جنگی رہتی تھی، اس زمانہ میں انصار کے دو بڑے قبیلے اوس و خزرج بھی مدینہ میں تھے، ان میں برابر قبائلی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، ان کی جنگوں میں یہود کے قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر اوس کے حلیف ہوتے اور بنو قینقاع خزرج کا حلیف ہوتا، اس طرح یہ اپنے حلیفوں کے ساتھ ہو کر اپنے ہی بھائیوں کو قتل کرتے اور جلا وطن کرتے تھے۔ ایک طرف تو خدا کے حکم اور اس سے باندھے ہوئے عہد کو یوں توڑ تاڑ رہے تھے اور دوسری طرف ان لوگوں کو جنھیں دشمن قید کر لیتے تھے فدیہ دیکر چھڑا بھی لیتے تھے، اور کہتے کہ اس کی ان کو توراۃ نے تعلیم دی ہے، حالانکہ توراۃ میں جس طرح یہ تعلیم تھی اسی طرح اس میں بھائیوں کے قتل کرنے اور جلا وطن کرنے کی ممانعت بھی تھی، اسی کو قرآن نے ایمان ببعض الکتاب اور کفر ببعض الکتاب کہا ہے کہ جو حکم ان کی خواہش کے موافق ہوتا اس کو مان لیتے تھے اور جو خواہش کے خلاف ہوتا اس کو بالائے طاق رکھ دیتے۔

فساد فی الارض | یہود فتنہ و فساد کا سرچشمہ تھے، قرآن نے انکی اس عادتِ بد کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۤءَ	اور ہم نے ان کے اندر دشمنی اور کینہ قیامت تک
اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا	کے لیے ڈال دیا ہے، جب جب یہ لڑائی کی کوئی
لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ	آگ بھڑکائیں گے اللہ اس کو بجھا دیگا، یہ زمین میں
فَسَادًا وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ	فساد کرنے میں سرگرم ہیں اور اللہ فساد برپا
(مائدہ : ۶۴)	کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فساد خدا کے قانون سے انحراف و بغاوت کا نام ہے، جب کوئی قوم حق و عدل کا رویہ ترک

کر کے قانون الٰہی کی خلاف ورزی کرتی ہے تو اس کے اندر فساد رونما ہوتا ہے، اور اس دنیا کا تکوینی و تشریعی
نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زمین سے صلاح و فلاح اور خیر و برکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اسی لیے خداوند قدوس
نے قانون الٰہی کو توڑ کر دنیا کے امن و نظام میں خلل نہ پیدا کرنے کی انکو اس طرح ہدایت کی تھی:-

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ — کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ پھرو
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ (بقرہ) — زمین میں فساد مچانے والے بن کر۔

لیکن ان کی تاریخ فسادات اور نظام عالم میں خلل پیدا کرنے کے واقعات سے
بھری ہوئی ہے، سورہ بنی اسرائیل میں ان کے دو فساد کا ذکر ہے، فرمایا:-

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ — اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں اپنا یہ فیصلہ بتا دیا تھا کہ
فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا (بنی اسرائیل) — دو مرتبہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور بہت سر اٹھاؤ گے

اس زمانہ میں بھی انکے اندر زبردست فساد اور بگاڑ پیدا ہو گیا جب فلسطینیوں نے ان کا مقدس
تابوت چھین لیا تھا،

دوسروں میں فساد برپا کرنا بھی انکا محبوب مشغلہ تھا حضرت موسیٰؑ تورات لینے گئے تو ان لوگوں نے
ایک بچھڑے کی پرستش شروع کر کے ان میں اور انکے جانشین اور بھائی حضرت ہارونؑ میں نفرت اور بگاڑ پیدا
کرنا چاہا[1]، اسی طرح جب عہد سلیمان میں خدا کی کتاب کو پس پشت ڈالکر لوگ سحر و شعبدہ اور سفلیات میں
پڑ گئے تو دو فرشتوں ہاروت و ماروت سے محبت و نفرت کا علم حاصل کیا تاکہ میاں بیوی میں تفریق اور جدائی پیدا کر
کے معاشرت و تمدن کے نظام کی بنیادیں کھوکھلی کر سکیں[2]، مسلمان انکی مفسدانہ سرگرمیوں کا سب سے زیادہ ہدف تھے
اور یہود نے انکے درمیان فساد اور بگاڑ پیدا کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا[3]، عہد نبوت کے مسلمانوں میں نفاق کی
تخم ریزی اور عہد عثمانی کے فتنوں کو ہوا دینے والے یہی لوگ تھے، اس زمانہ کا خاص فتنہ اشتراکیت جو قوموں
اور حکومتوں میں تصادم پیدا کرنے میں اپنی نظیر آپ ہے، ان ہی کے ذہن کی پیداوار ہے۔ (باقی)

---
[1] اعراف: ۱۴۲ و طٰہٰ: ۸۵ تا ۹۰ [2] بقرہ: ۱۰۲ [3] آل عمران: ۱۱۸

وفیات

نواب علی یاور جنگ بہادر

از سید صباح الدین عبد الرحمن

گذشتہ ماہ دسمبر میں نواب علی یاور جنگ بہادر گورنر بمبئی کا انتقال ہو گیا،
۱۹۴۷ء کے بعد حکومت ہند کی طرف سے ان کو بڑے بڑے عہدے ملتے رہے، وہ امریکہ میں ہندستان
کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنائے گئے، بمبئی کی گورنری
کے عہدے پر مامور ہوئے، اور اسی ریاست کے گورنر کی حیثیت ہی سے عالم بقا کو سدھارے،
اور معلوم نہیں کتنے دوسرے اعزاز ان کو حاصل ہوتے رہے، حکومت ہند کے معتمد ترین حکام
میں ان کا شمار ہوتا رہا،

میں نے ان کو کسی بڑے عہدیدار کی حیثیت سے نہ جانا اور نہ پہچانا، بلکہ ان سے نواب
عماد الملک کے نواسے کی حیثیت سے ملتا رہا، نواب عماد الملک دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ
کے پہلے صدر تھے، جن کا احسان دار المصنفین پر بہت بڑا تھا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے علامہ
شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کا ماہانہ وظیفہ دار المصنفین کے نام منتقل ہوا جس سے اس کی تاسیس
میں بڑی مدد ملی، وہ دار المصنفین کے بڑے قدر داں اور سرپرست رہے، جب انکی وفات
۳ رجب ۱۹۲۶ء کو ہوئی تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف کے شذرات

یں اپنی غیر معمولی سوگواری کا اظہار کیا، جس میں اُن کے اور بہت سے فضائل اور محاسن کے ساتھ مولانا شبلی، دار المصنفین اور خود ان سے جو تعلقات رہے، اس کا ذکر بہت ہی خوش عقیدگی سے کیا، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں :-

"آخر عمر میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو سولہ ۱۶ پاروں تک ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے رک گیا، اس ترجمہ میں بالکل بائیبل کی زبان اختیار کی ہے"۔

"مولانا شبلی مرحوم سے ان کا تعلق سرسید کے زمانہ سے اور ان ہی کے واسطہ سے ہوا تھا، چنانچہ مرحوم ان کی بڑی قدر فرماتے تھے"

"الفاروق کی تالیف میں ان کی حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے، جامعہ عثمانیہ جس کا پہلا نام حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پڑا تھا، اس کے نصاب اور خاکہ کی تیاری کے لیے مولانا شبلی مرحوم کا انتخاب ان ہی کے اشارہ سے ہوا تھا، اور ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم کی ماہانہ تنخواہ میں دو سو ۲۰۰ کا اضافہ نواب صاحب ہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے منظور فرمایا"۔

مولانا شبلی مرحوم سے اس تعلق اور دار العلوم ندوہ کی تعلیم میں مشرقی و مغربی علوم و فنون کی جامعیت کی بنا پر اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ندوہ کو اپنا قیمتی کتب خانہ عطا فرمایا اور ہر موقع پر طلبائے ندوہ کی سرپرستی و قدردانی کرتے رہے۔
مولانا شبلی کی نسبت اور ایک علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے انھوں نے دار المصنفین کے ساتھ ابتدا ہی سے اپنا شغف ظاہر فرمایا اور جس کو آخر زندگی تک قائم رکھا، چنانچہ جب دار المصنفین قائم ہوا تو ان ہی کی سفارش سے مولانا شبلی مرحوم کی تین سو ۳۰۰ ماہوار رقم سرکار

آصفیہ نے دار المصنفین کے نام منتقل کر دی، اس کے ساتھ خاص اپنی جیب سے انھوں نے اس کے لیے سالانہ سو ۱۰۰ روپے کی رقم مقرر فرمائی اور مجھے لکھا کہ دار المصنفین پہلا انسٹیٹیوشن ہے جس کیلئے میں یہ مستقل رقم مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ رقم ان کے حوصلہ کے مطابق نہ تھی، اس لیے اس پر ہمیشہ تاسف و ندامت کا اظہار کرتے رہے، وہ دار المصنفین کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدر نشین تھے، اور آخر تک اس تعلق کو قائم رکھا، معارف کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے اور جو مضمون پسند آتا اس پر خوشی ظاہر کرتے، اس کے لکھنے والے کے حالات دریافت فرماتے، مولانا عبد الباری ندوی سے ان کا تعارف اسی طرح ہوا، دار المصنفین کی تصنیفات جب انکی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں تو ان کو لازمی طور پر پڑھتے تھے، اور اگر ضعف و علالت کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے، ان تصنیفات کے پہنچنے پر مجھے جو خط لکھتے اس میں ان کی داد دیتے تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے تھے"۔

خود سید صاحب اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ

"آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا، خصوصاً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، انکی شفقتِ بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے، خط و کتابت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاذ مرحوم کی وفات پر جو اردو مرثیہ میں نے لکھا تھا وہ ان کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ حوالۂ قلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا۔ فرمایا عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہیے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہو سکے گا، حیدرآباد جب جانا ہوا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، اسلامی علوم و فنون، تمدن و

تاریخ گفتگو کا موضوع ہوتا. ہمیشہ اپنے مکتوبات سے ممنون فرماتے ۔"

نواب علی یاور جنگ کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ محض اس لیے رہا کہ وہ علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ کے بہت بڑے قدر دان اور دار المصنفین کے بہت بڑے مربی کے نواسے تھے،

وہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، تو ان کا ایک خط دار المصنفین آیا کہ بزم صوفیہ ان کے نام سے وی. پی. بھیجی جائے، مجھکو تعجب ہوا کہ ان کو تصوف سے کیسے ذوق پیدا ہوگیا، میری پہلی ملاقات دہلی میں ان سے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ایک جلسہ میں ہوئی، میں اس کونسل میں دار المصنفین کی نمایندگی بارہ ۱۲ سال تک کرتا رہا، جب نواب علی یاور جنگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو اس کونسل کے وہ بھی رکن ہوئے، وہ پہلی دفعہ اس کے جلسہ میں شریک ہوئے تو جب ان کو معلوم ہوا کہ میں دار المصنفین سے آیا ہوں تو جلسہ کے بعد اور تمام معزز اراکین کو نظر انداز کرکے میری طرف بڑھے، دار المصنفین سے متعلق پوری تفصیلات حاصل کرتے رہے، کہنے لگے کہ ان کو دار المصنفین سے بڑی دلچسپی رہی ہے، اس لیے کہ جب علامہ شبلی میرے نانا عماد الملک سے ملنے آتے تو وہ مجھکو اپنی گود میں بٹھا لیتے، وہ دونوں کی علمی گفتگو سمجھ تو نہیں سکتے لیکن غیر شعوری طور پر ان کی باتوں کا نقش ان کے ذہن پر رہا، پھر کہنے لگے کہ وہ اب بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ وہ علامہ شبلی کی گود میں بیٹھے، بلکہ وہ اپنے کو ان کی گود کا پروردہ سمجھتے ہیں، وہ علامہ شبلی کی تصانیف، ان کے اسلوب، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انکی جانشینی کا جو حق ادا کیا ہے اور پھر ان سے جو ملاقاتیں ہوتی رہیں اس پر اتنی دیر تک گفتگو کرتے رہے کہ جائے کی ایک نشست ختم ہوگئی اور ہم دونوں وہاں نہیں پہنچ سکے،

اسی کے دوسرے سال میں کسی کام سے دہلی گیا تو ایک روز اپنے بہت ہی معزز کرم فرما اور دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ انکی موٹر گاڑی پر کہیں جانا ہوا، انھوں نے راستہ میں کہا کہ وہ ذرا انٹرنیشنل کلب بھی تھوڑی دیر ٹھہریں گے، وہاں پہنچکر وہ کلب کی عمارت میں چلے گئے، میں موٹر ہی میں بیٹھا رہا، وہ باہر آئے تو ان کے ساتھ نواب علی یاور جنگ بہادر بھی تھے، زیدی صاحب نے فرمایا کہ میں موٹر میں بیٹھا ہوں تو وہ مجھ سے ملنے چلے آئے ہیں، پھر تو ایک خوشگوار شام گذری، جس میں نواب عماد الملک، علامہ شبلی اور سید صاحب پر دیر تک گفتگو رہی، سید صاحب سے حیدر آباد میں جو ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ان کا ذکر بھی کرتے رہے، پھر فرمایا کہ جب وہ امریکہ میں سفیر تھے تو تذکرۂ سلیمان مولفہ غلام محمد کا اشتہار دیکھا، کراچی سے خاص طور پر یہ کتاب منگوائی، اور جب یہ کتاب پڑھی تو اس میں مولانا سید سلیمان ندوی نظر نہیں آئے، میں نے اس پر ان سے عرض کیا کہ یہ کتاب آپ کے لیے نہیں لکھی گئی، پھر کہنے لگے کہ وہ سید صاحب کو ایک مصنف، ایک محقق، ایک مورخ اور ایک ادیب کی حیثیت سے جاننا چاہتے تھے، میں نے اثنائے گفتگو میں عرض کیا کہ آپ کے نانا نواب عماد الملک سید صاحب کے ذہن پر برابر چھائے رہے، ان کی زبانی میں نے سنا کہ جب علامہ شبلی کی رحلت ہوئی تو انھوں نے بہت دکھ اور درد کے ساتھ ان کا نوحہ لکھا جو اخباروں میں چھپا تو ہر طرف سے اس کی تعریف ہوئی، عزیز لکھنوی نے بھی اس کو پسند کیا، مگر نواب عماد الملک کو شاید پسند نہ آیا، اس لیے انھوں نے سید صاحب کو لکھ بھیجا کہ وہ بازار میں اپنی کسی چیز کو اس وقت تک پیش نہ کریں جب تک کہ ان کو یقین کامل نہ ہو کہ بازار میں اس سے بہتر چیز کوئی اور پیش نہیں کرسکتا، میں نے کہا کہ سید صاحب نے یہ بیان کرکے فرمایا کہ نواب صاحب کی یہ نصیحت ذہن پر برابر چھائی رہی، اور اپنی تحریر اور تصنیف کی طباعت واشاعت سے پہلے نواب صاحب برابر ذہن کے سامنے کھڑے رہتے، نواب علی یاور جنگ نے اپنے نانا کی یہ نصیحت سنی تو بہت محظوظ ہوئے اور بولے کہ دار المصنفین کو یہ نصیحت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے، میں نے عرض کیا "حتی الوسع یہ پیش نظر ہے"۔

ان سے میری یہ دو ملاقاتیں آئی گئی ہوگئیں، دسمبر ۱۹۷۳ء میں شاہ صاحب کی وفات ہوئی

تو ان کا یہ مکتوب میرے نام پہنچا:۔

راج بھون، ۱۸ر جنوری ۱۹۷۵ء

مکرمی!

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر مجھکو شاق گذری، خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں لے، میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی البتہ اپنے نانا کے توسط سے مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے نیاز حاصل تھا، بچپن میں تو مولانا شبلی مرحوم کو بھی اپنے نانا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا، اور کبھی کبھی ان کی گود میں بیٹھنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔

علی یاور جنگ

اس کے بعد امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا جانے لگا، تو اس کے وہ روح رواں بن گئے، میرے نام سے بھی ان کے دستخط سے ایک گشتی مراسلہ پہنچا، امیر خسرو سے مجھکو عشق رہا ہے، اس لیے میں نے ان پر انگریزی میں ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجدیا، فروری ۷۵ء میں دہلی میں امیر خسرو پر انٹرنیشنل سیمینار کی تاریخیں مقرر ہوئیں تو ان ہی کے دستخط سے میرے نام سے بھی شرکت کے لیے ایک دعوت نامہ پہنچا، میں ان ہی دنوں دار المصنفین کے کام سے پاکستان جانے والا تھا، اس لیے میں نے اس دعوت نامہ کی رسید نہیں بھیجی، جب سیمینار کا وقت قریب آیا تو ایک روز نواب علی یاور جنگ صاحب کا ایک لمبا تار میرے نام سے پہنچا کہ میری شرکت ضروری ہے،

اس تار پر اس میں شرکت کے لیے آمادہ ہوگیا، وہاں پہنچا تو نواب علی یاور جنگ اس طرح ملے جیسے میری اور ان کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہی ہیں، ملتے ہی کہا کہ حیات سلیمان چھپ گئی ہے، مجھکو اس کے پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی،

سیمینار میں انگلستان، روس، شام، ترکی، مصر، عراق اور بنگلہ دیش کے بھی نمایندے آئے ہوئے تھے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے عربی اور فارسی کے اساتذہ بھی موجود تھے، بڑا اچھا اجتماع تھا، صدر جمہوریہ ہند نے اس کا افتتاح کیا، اس کے بعد ایک علحدہ کمرہ میں سیمینار شروع ہوا، تو یہ بھر گیا، جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی، شام کے نمایندے کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی، مگر اس میں نواب علی یاور جنگ بہادر ہی پورے طور پر چھائے رہے، انھوں نے جب یہ کہا کہ عماد الملک کے نواسے کی تقریب میں عماد الملک کا نواسہ موجود ہے، تو بہت پسند کیا گیا،

انھوں نے کمرے کو ضرورت سے زیادہ لوگوں سے بھرا ہوا دیکھا تو ذرا جھلاہٹ کے لہجہ میں مجمع کو مخاطب کر کے کہا "جن کے پاس دعوت نامے نہیں ہیں وہ باہر نکل جائیں"، اس سے مجمع میں کھلبلی سی مچ گئی، نواب صاحب نے ایک صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ کیسے آگئے ہیں، باہر چلے جائیں"، اس سے اور بھی تکدر بڑھا، مگر پھر فضا خوشگوار ہوگئی، جلسہ ختم ہوا تو نواب صاحب کے لب و لہجہ پر تنقیدیں ہو رہی تھیں، مگر پوری تقریبات نواب صاحب کی وجہ سے بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پائیں، انھوں نے ہر مقرر اور مقالہ نگار پر اچھے اچھے تبصرے کیے، اسی لیے میں نے معارف کے شذرات میں جب اس سیمینار کا ذکر کیا تو نواب صاحب کی ابتدائی ڈانٹ پھٹکار کو زیادہ نمایاں نہیں کیا جس سے بعض دوست میرے شاکی بھی ہوئے،

اس سیمینار میں امیر خسرو کے کچھ مخالفین اور ناقدین بھی جمع ہوگئے تھے، جنھوں نے ان پر یہ کہہ کر اعتراضات کیے کہ وہ صوفی کسی معنی میں نہ تھے، خواجہ نظام الدینؒ اولیاء سے ان کی ارادت نہ تھی، وہ ایک چالاک آدمی تھے، اس لیے دربار سے، ہر حکمراں سے تعلقات رکھتے رہے وہ موسیقی کے ماہر نہ تھے، ان کی ہندو دشمنی سے متعلق بھی کچھ باتیں بیان کی گئیں، وغیرہ وغیرہ، سیمینار

میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ کے جناب پیر ضامن علی اور جناب حسن ثانی بھی تھے، وہ دونوں یہ سب کچھ سن کر دم بخود تھے، مگر خاموش تھے، میرے لیے بھی یہ اعتراضات ناخوشگوار بلکہ ناقابلِ برداشت تھے، بے چین ہو کر میں نے ہر ایک سے ٹکر لی، اور امیر خسرو سے متعلق میرا جو کچھ مطالعہ تھا اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ نواب صاحب نے مجھ کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے بہت کافی وقت لیا، کچھ اور لوگوں کو بھی بولنے کا موقع دوں، میں نے ان سے عرض کیا کہ میں اس لیے برابر بول رہا ہوں کہ عماد الملک کے نواسے امیر خسرو نے سات سو برس میں جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ عماد الملک کے نواسے کی موجودگی میں اس دو روزہ کے سیمینار میں ان سے چھین نہ لیا جائے، یہ سنکر مجمع کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگے، چائے کا وقفہ ہوا، تو وہ میرے پاس آئے اور بولے کہ میں دار المصنفین کی نمائندگی کا پورا حق ادا کر رہا ہوں اسی وقت ایک روسی نمائندہ بھی میرے پاس پہنچ گئے، اور مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں نواب صاحب نے شبلی اکیڈمی کا نام بتایا، تو روسی نمائندے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھکر کہا کہ اس اکیڈمی کی نمائندگی پورے طور پر ہو رہی ہے، میرے کچھ علمی دوستوں نے بھی کہا کہ میرا آنا اچھا ہوا ورنہ معلوم نہیں اس سیمینار میں امیر خسرو کہاں لیجا کر پٹک دیے جاتے، سیمینار کے دوسرے دن راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا، میں بھی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا، صدر جمہوریہ سے بڑھ بڑھ کر سبھی مل رہے تھے، وہ دار المصنفین کے بڑے محسن، ہمدرد اور سرپرست رہے ہیں، اس کی رکنیت بھی قبول فرما کر اس کی عزت بڑھائی ہے، میں بھی ان کی خدمت میں پہنچ کر شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس بھیڑ بھاڑ میں پہنچنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، دور سے نواب علی یاور جنگ صاحب کی نظر میرے اوپر پڑی، وہ میرے پاس آئے اور مجھکو اپنے ساتھ صدر صاحب کے سامنے لا کھڑا کر دیا، اور پھر میں نے سمینار میں جو حصہ لیا اس کا ذکر

کرنے کے ساتھ میرے اور میری تصانیف کے لیے ایسے ایسے کلمات خیر کہے جن کا میں اپنے کو مستحق نہیں پا رہا تھا، میں دونوں بزرگوں کے سامنے شرمندہ ہو رہا تھا، میں ان سے رخصت ہوا تو عرض کیا کہ میں دہلی سے بمبئی پی، ایچ، ڈی کے ایک مقالہ کا ممتحن بن کر جا رہا ہوں، وہ بولے، میں بمبئی میں ان سے ضرور ملوں، بمبئی میں کچھ ایسا مشغول رہا کہ ان سے وقت مقرر کرنے کا موقع نہ ملا، جب چلنے لگا تو ان کے سکریٹری سے ان کی مشغولیتوں کا پروگرام معلوم ہوا تو میں ان سے ملے بغیر بمبئی سے اعظم گڈھ کے لیے روانہ ہوا،

اعظم گڈھ آکر حیات سلیمان کے ساتھ کچھ اور کتابیں ان کی خدمت میں بھیج دیں، پھر پاکستان چلا گیا، جہاں دار المصنفین کے کام کے سلسلہ میں سات مہینے قیام کرنا پڑا، اس اثنا میں نواب صاحب کے دو عنایت نامے موصول ہوئے جو یہ تھے:-

راج بھون، مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۷۶ء

مکرمی!

چاروں کتابیں جن میں سے سچی کہانیوں کے دو حصے ہیں وصول ہوئیں، جن کا از حد شکریہ، مطالعہ بزم صوفیہ کی طبع ثانی سے شروع کیا ہے، جس کا بہت انتظار تھا، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم سے مجھے بڑا انس تھا اور ان کی حیات کو بھی بڑے شوق سے پڑھوں گا، مجھے علم ہے اور افسوس بھی کہ آپ بمبئی تشریف فرما تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے، مگر اتنے دن دہلی میں رہنے کے بعد واپسی پر کام کا انبار جمع ہو گیا تھا، اس کے علاوہ پے در پے کمیٹیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، اس لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں اور امید ہے کہ آپ مجھے بخش دیں گے، جی چاہتا ہے کہ اب اعظم گڈھ ہی میں ملاقات ہو، دار المصنفین سے نانا مرحوم کو بھی دیرینہ علمی تعلق رہا، اسکے کتب خانہ

کو بھی خاص طور سے دیکھنا چاہتا ہوں، یہ کب ہو سکے گا، خدا ہی جانتا ہے، مگر میں
اس کے لیے برابر دعا کر رہا ہوں۔ فقط علی یاور جنگ

راج بھون بمبئی، مورخہ ۱۱ رمئی ۷۶ء

مکرمی!

ابھی اس سوچ میں لگا ہوا ہوں کہ کب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور دارالمصنفین
کا کتب خانہ دیکھوں جس میں جی لگا ہوا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ
کی سوانح عمری کا مطالعہ ختم ہو گیا، کتاب مجھے بے حد پسند آئی، اور مولانا مرحوم بہت
یاد آئے، چند روز ہوئے حیدرآباد جانے کا موقع آیا تو اس مکان کو بھی دیکھا جہاں
عماد الملک بہادر اپنی عمر کے آخری حصہ میں رہا کرتے تھے، اور جہاں مجھے پہلی بار
مولانا سید سلیمان ندوی سے شرف ملاقات حاصل ہوا، اس وقت اس مکان میں آل انڈیا
ریڈیو بسا ہوا ہے، ان کا سابقہ مکان بلگرامی ہوز بھی کمرہ دیکھا جو انھوں نے
میری والدہ کو دیدیا تھا اور جس میں میں پیدا ہوا، میں نے خاص طور سے وہاں اس کمرے کا
بھی معائنہ کیا جس میں وہ مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات کیا کرتے تھے، اس طرح آپ کی
بھیجی ہوئی کتاب کیا پڑھی کہ سارا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔

معارف کی اس اشاعت کا شکریہ جس کے شذرات میں سمینار کا ذکر خیر کیا گیا ہے،
جو آپ ہی کے قلم مبارک سے لکھا گیا ہے، اگر اس اشاعت کی تین یا چار کاپیاں اور مجھے
مل سکیں تو ضرور بھیجیے، میں ممنون ہوں گا، سمینار میں آپ کی عالمانہ تقریریں
مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی جنھوں نے بالخصوص تصوف کے موضوع پر مباحث کو
اتنے بلند پایہ پر رکھا۔ فقط علی یاور جنگ

محبی مولانا عبد السلام ندوی میری عدم موجودگی میں دارالمصنفین کی ڈاک کے جوابات
دیتے رہے تھے، نواب صاحب کے خطوط کے بھی جوابات دیے، مگر شاید ان کے سامنے پیش نہیں
کیے گئے، میں پاکستان سے واپس آیا تو اپنی ڈاک میں یہ دو خطوط بھی پڑھے، ان کا جواب دیا، مگر
جواب دینے میں عجلت نہیں کی، خیال ہوا کہ ان کے جوابات تو جا چکے ہیں، میں نے ان کو جو خط
لکھا اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، اس لیے ان کے جواب کا انتظار نہ تھا، ایک رات
یکایک ان کی وفات کی خبر ریڈیو سے ملی، تو بڑا دکھ ہوا، ان کی علالت کی خبر نہ ملی تھی، اسلیے
ان کی المناک وفات کی خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا، ان کی ملاقاتیں اور ان کی باتیں
یاد آتی رہیں، سرکاری حلقوں میں ان کی اہمیت کا اندازہ تو پہلے ہی سے تھا، انکی موت
پر صدر جمہوریۂ ہند اور وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے جو تعزیتی پیغامات شائع ہوئے اس سے
ان کی سرکاری حیثیت کی اہمیت کے اندازہ میں اور بھی اضافہ ہوا،

ان کی وفات کے چار روز کے بعد ان کا یہ مکتوب ملا:-

راج بھون بمبئی۔ مورخہ ۲ دسمبر ۱۹۷۶ء

مکرمی!

آپ کے خط مورخہ ۹ نومبر کا شدید انتظار تھا، اور اب معلوم ہوا کہ کیوں میرے
دو پچھلے خطوں کے جواب نہیں آئے۔ اس بیچ میں قلب کے عارضہ سے میں بیمار پڑ گیا
تھا اور آپریشن کروانا پڑا، اب خدا کے فضل سے رفتہ رفتہ رو بصحت ہوتا جا رہا ہوں،
اس وقت دہلی جانے کا ارادہ نہیں ہے، مگر جب بھی ہوا تو وہاں سے اعظم گڑھ ضرور
آؤں گا اور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا جس کے لیے جی تڑپ رہا ہے،
رسالہ معارف کے اس خاص شمارے کی دو تین کاپیاں جن کی مجھے ضرورت تھی

اور جن میں شذرات کے تحت سمینار کے بارے میں بڑا قدردانہ مضمون شائع ہوا تھا، ان کو بھیجنا نہ بھولئے، انتظار رہے گا، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ سمینار کے ریکارڈ میں رہیں۔ فقط

علی یاور جنگ

اس خط کو پڑھ کر ان کی وفات کی سوگواری میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ علامہ شبلی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور دارالمصنفین کا ایک بڑا قدردان جاتا رہا، اس حیثیت سے وہ یاد آتے رہے اور اکثر یاد آتے رہیں گے،

ان کی زندگی میں ان کے ناقدین بھی رہے، بعض حلقوں میں ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی جسکی بازگشت انتہا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے جلسہ میں پہنچ گئی تھی، مگر انھوں نے اپنے لیے جو دنیا بنائی تھی، اس میں وہ کامیاب رہے اور کامیاب اس دنیا سے رخصت ہوئے ان میں کمزوریاں بھی رہی ہوں گی، مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں، اللہ تبارک تعالیٰ ان کی عاقبت کو بھی بخیر کرے۔ آمین

ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں

امیر خسرو نسلاً ترک تھے، لیکن ان کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی تھی، اس لیے قدرتی طور پر ان کو اپنے وطن ہندوستان کے ایک ایک ذرہ سے محبت تھی، اور اس کی ایک ایک چیز کا اپنی تمام مثنویوں میں بہت والہانہ انداز سے کیا ہے، جن کو پڑھ کر امیر خسرو کے عہد کے ہندوستان کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن،

قیمت: ۷۰-۱۴

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب علی جواد زیدی صاحب تہران

وہ نگہ فسانہ گو، زخم فروش و دل گداز
وہ نگہ بہانہ جو، عشوہ فروش و دل نواز

بادہ کشانِ عصرِ نو، جن کو تھا سرکشی پہ ناز
لغزشوں سے سمجھ گئے کیا ہے نشیب، کیا فراز

رندوں نے میکدے میں آج شکل یہ کیا بنائی ہے
جیسے غمِ جہاں میں غرق، وقتِ دعا صفِ نماز

نغمۂ زیرِ لب سہی، آہِ سحر گہی مری
میں نے مگر صدا سنی، کوئی تو در ہوا تھا باز

درد بھی تھی، دوا بھی تھی، انکی ہنسی ہنسی کی بات
بھید کھلے جو حُسن کے، بن گئے زندگی کے راز

کتنے لبوں پہ چھا گئے نغمۂ و شور و حرفِ شوق
کتنے دلوں میں رہ گئے کتنے دنوں کے تلخ راز

کتنے وجودِ بے نمود، تو نے صنم بنا دیے
اے خردِ وفا تراش، تیری حیات ہو دراز!

ہے یہی زندگی اگر، منتشر و بغیر سمت
پھر تو خطا معاف ہو، زندگی سے ہم آئے باز

لفظوں کے نظم و بست سے شعر کرشمہ بن گیا
فکر کے نظم و ضبط سے، شعر بنا نظر نواز

زیدیؔ رمز آشنا، تو بھی ہے ایک سر پھرا
عشق کا کس کو حوصلہ، کس کو ہوس سے احتراز

مطبوعات جدیدہ

تفسیر قرآن (تفسیر ماجدی) جلد سوم :- از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم،

بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۱۲ - قیمت [illegible] - پتہ:

صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ۔

یہ حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی تفسیر قرآن کی تیسری جلد ہے جو گیارہویں پارہ کے ترجمہ وتفسیر پر مشتمل ہے، اس کی پہلی اور دوسری جلد پر معارف میں مفصل ریویو چھپ چکا ہے، یہ جلد بھی ان خصوصیات سے پوری طرح مزین ہے، یعنی قدیم تفسیروں کے چیدہ مباحث اور دور حاضر کے علمی وسائنسی انکشافات نقل کرکے آیتوں کا مفہوم اور ان کا ہر ہر پہلو واضح کیا گیا ہے اور مستشرقین ومتشککین کے شبہات اور مغالطوں کی تردید بھی کی گئی ہے، اس کی بڑی خوبی اختصار وجامعیت ہے، ترجمہ کی روانی، شگفتگی اور سلاست کے لیے مولانا کا نام نامی ہی کافی ہے، شروع میں ایک اندکسی اور مختصر مقدمہ بھی ہے جو بڑا پرمغز اور مولانا کے خاص انداز کا نمونہ ہے، قرآن مجید کے طالب علموں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کو اس تفسیر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، ان سطروں کے لکھتے وقت مولانا کی وفات کی خبر ملی، وہ جاچکے، مگر اپنے پیچھے اپنی تفسیر کی شاندار یادگار چھوڑ گئے۔

مقدمہ لطائف اشرفی : از ڈاکٹر سید وحید اشرف صاحب علیگ، بڑی تقطیع، کاغذ عمدہ ٹائپ، صفحات ۷۰ - قیمت [illegible] روپے - پتہ: از مصنف شعبۂ فارسی و اردو فیکلٹی آف آرٹ، مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ، ہند۔

ڈاکٹر سید وحید اشرف استاذ شعبۂ فارسی واردو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ کو حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سے خاندانی تعلق ہے، اس سے پہلے وہ انکے حالات وسوانح پر ایک کتاب لکھ چکے تھے جس پر معارف میں چند ماہ قبل ریویو شائع ہوچکا ہے، اب انھوں نے ان کے ارشادات وملفوظات کے مجموعہ اور تصوف کی مشہور ومقبول کتاب لطائف اشرفی پر فارسی زبان میں ایک مقدمہ تحریر کرکے شائع کیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے میں مصنف کا اور دوسرے میں تصنیف کا تعارف کرایا گیا ہے، پہلا حصہ چھ ابواب کا اور دوسرا چار کا مجموعہ ہے، پہلے حصہ میں حضرت اشرف جہانگیرؒ کے سوانح کے مآخذ، تاریخ ولادت ووفات، ابتدائی حالات، امراء وسلاطین سے تعلقات، علمی وادبی کمالات اور تصنیفات کی فہرست دی گئی ہے، یہ حصہ دراصل مصنف کی اردو کتاب کی تلخیص ہے، اس میں صاحب سوانح کی تاریخ ولادت ووفات کی تحقیق میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے، یہ اور دوسرے حصہ کے اکثر مباحث پہلے معارف میں بھی چھپ چکے ہیں، لطائف اشرفی کے تعارف میں پہلے اس کے جمع وترتیب اور حضرت سید اشرفؒ کی زندگی ہی میں اس کے بڑے حصہ کے مرتب ہوجانے کی دلیلیں اور اس کے مضامین ومندرجات اور اہم مآخذ کی فہرست دی گئی ہے، پھر اس کے بعد کی صوفیانہ کتابوں خصوصاً نفحات الانس جامی کے مآخذ ہونے کا ثبوت بیان کیا گیا ہے، آخر میں اس کی علمی وادبی اہمیت اور تصوف کی بلند پایہ کتاب ہونے کا ذکر ہے، یہ مقدمہ بڑی محنت سے لکھا گیا اور قابل مطالعہ ہے، لیکن اسکی قیمت زیادہ ہے۔

فہرست مخطوطات عربی رضا لائبریری جلد چہارم وپنجم (انگریزی) مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۴۱۶ و ۲۲۴ مجلد قیمت [illegible] پتہ رضا لائبریری ٹرسٹ رامپور۔

یہ رضا لائبریری رامپور کے عربی مخطوطات کی فہرست کی چوتھی اور پانچویں جلدیں ہیں، جو حکومت ہند کی وزارت تعلیمات کی امداد سے شائع کی گئی ہیں، چوتھی جلد میں زہد وتصوف، انجیل مقدس،

اور منطق و فلسفہ کی کتابوں کی فہرست ہے، اور پانچویں جلد میں حساب، ریاضی، طب، طبیعیات، زراعت، کیمیا، ہیئت، نجوم، فلکیات، علم الحروف، اخلاق، سیاست مدن اور حرب و مغازی کی کتابوں کا ذکر ہے، فہرست میں تصنیف و مصنف اور کاتب کے نام، سنہ وفات، مخطوطہ کے زمانۂ تحریر و تصنیف صفحات اور سطروں کی تعداد، شان خط، سائز اور مکمل یا ناقص ہونے کی تصریح کی گئی ہے، زہد و تصوف میں سنی، شیعہ اور زیدیہ فرقوں کی کتابوں کی علٰحدہ علٰحدہ وضاحت ہے،

دونوں جلدوں کے مختصر مقدمہ میں ان کے مخطوطات کی تعداد اور زیادہ قدیم مخطوطات کے نام اور اہم خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، فہرستوں کی اشاعت سے علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے، دونوں جلدوں کی ترتیب و تدوین کی خوبی کے لیے فاضل مرتب کا نام ہی پوری ضمانت ہے۔

ذکر سیدین:۔ مرتبہ جناب شمسی طہرانی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۵۹ مجلد مع گرد پوش، قیمت دس روپے۔ پتے: (۱) کتبخانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی (۲) ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ۔

خواجہ غلام السیدین مرحوم ملک کے مشہور ماہر تعلیم، اردو و انگریزی کے لائق فاضل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مایۂ ناز فرد تھے، جناب شمسی طہرانی نے زیر نظر کتاب میں انکی زندگی کے خط و خال، فضل و کمال اور افکار و نظریات کو خود انکی اور دوسرے ارباب قلم کی تحریروں کی مدد سے پیش کیا ہے، پہلے انکی خاندانی نجابت، تعلیم، ملازمت، دردھا اسکیم میں کارنامے، مسلم یونیورسٹی اور دوسرے تعلیمی اداروں سے دلچسپی اور انکی محبوب شخصیتوں کا ذکر کیا ہے، پھر انکے طرز تحریر اور مرقع نگاری کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور انکے قومی، سیاسی اور تعلیمی خیالات اور ذہنی و اخلاقی عظمت، رواداری، امن پسندی اور حب الوطنی کی مصوری کی گئی ہے، گو اس مختصر کتاب سے خواجہ صاحب کی سوانح عمری کا مکمل حق ادا نہیں ہو سکتا، تاہم اس سے انکے آیندہ سوانح نگاروں کو مدد ملے گی، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے۔

'ض'

جلد ۱۲۰ - ماہ صفر المظفر ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۷ء - عدد ۲

مضامین

شذرات

مقالات